اللہ تعالیٰ کے رحم اور فضل کے ساتھ

ماہنامہ

قندیلِ اَدب

مدیر رانا عبدالرزاق خاں

rana_razzaq@hotmail.com

فون نمبرز۔ 02089449385 07886304637

معاون مدیر و ڈیزائنر

عامر امیر.07903126126

majeedamer20@yahoo.com

نگران ویب سائٹ، ایاز راٹھور

www.bazmesherosukhan.co.uk

بزم شعروسخن برطانیہ کے زیرانتظام

مشاعرہ

صدر بزم داؤد ساجد قریشی

سیکریٹری بزم مبارک صدیقی

مہمانانِ خصوصی خان بشیر احمد رفیق / ایوب اولیاء /آدم چغتائی/ عامر امیر

مکرم ومحترم.....السلام وعلیکم ورحمۃ اللہ وبرکاۃ

مجلس شعروسخن لندن کے زیرانتظام ایک خوبصورت ادبی شام کا اہتمام کیا جارہا ہے اس میں برطانیہ کے معروف شعراء کرام اپنا کلام سنائیں گے۔ارشد لطیف، اقبال مرزا، ہارون الرشید، سوہن راہی، باسط کانپوری، سہیل لون، آدم چغتائی، مبارک صدیقی،، عامر امیر، نورالجمیل نجمی، بسم اللہ کلیم، جواد احمد، داؤد قریشی، ایوب اولیا بھی ہونگے۔داؤد قریشی کی کتاب ''سرِ راہ چلتے چلتے'' کی تقریب رونمائی بھی ہوگی۔نشستوں کے محدود ہونے کے باعث ادبی ذوق رکھنے والوں کو مدعو کیا جارہا ہے۔اس مشاعرے میں آپ کی شمولیت ہمارے لئے صد افتخار ہوگی۔آخر میں شرکاء مشاعرہ کے اعزاز میں دعوتِ طعام ہوگی۔

پروگرام:۔ مورخہ ۸ جون ۲۰۱۳ بروز ہفتہ بوقت شام ساڑھے چھ بجے شام بمقام

DEESIDE COMMUNITY HALL TOOTING SW17OPL

PH07886304637/07903126126

آرگنائزرز۔عامر امیر، فضل عمرڈوگر، محمد ابراہیم عابد، غضنفر شیخ، طارق مجید، آصف ندیم، عبدالمجید ظفر، بشارت زیروی،

چشم براہ:۔رمضان شائق، رانا عطاء اللہ، عطاء القادر طاہر، صاحبزادہ امتیاز احمد، پرویز احمد، مظفر چٹھہ، ظفر اقبال، راجہ منیر احمد،، اشرف خاکی، منور خورشید، نعیم رضا، شیخ عمران، وسیم احمد، سلیم الحق حسن خان، چوہدری صادقِ، رانا سعید۔علی احمد، رانا انتصار احمد، راجہ عطاء المنان

منجانب رانا عبدالرزاق خاں ایڈیٹر ماہنامہ ''قندیلِ اَدب'' لندن

Designed by AMER AMEER

فہرست مضامین

وضاحت،تبصرے،ثاقب زیروی رانا عبدالرزاق خاں،عبیداللہ علیم کا کلام۔چوہدری سر ظفراللہ خاں عاصی صحرائی،غزل مبارک صدیقی،خودکو پہچانئے۔اے آر راجپوت،راشد متین،،دھواں عامر امیر،عقیل دانش،انسان کی عمر،عاصی صحرائی،عورت کا جغرافیہ اے آر راجپوت،،نیم پوش، انسانوں کے تین گروہ.راجہ منیر احمد
ماں،اچھی ماؤں کی ضرورت،فرخندہ رضوی،سید معراج جامی،یہ بے چارے شاعر ابن لطیف،نزہت انجم،قریشی داؤد احمد ساجد، عابد حسن منٹو کے خیال میں بخش لائلپوری کی شاعری،بخش لائلپوری، حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ ، سہاشیوی، پروفیسر گوپی چند نارنگ کے خیال میں سید اقبال حیدر کی شاعری،آسان نسخہ،زندگی کیا ہے، غالب ماجدی،زہرہ نگاہ، حاثات بیسویں صدی کے،مختصراور عجیب،جنت دوزخ کی زبانیں، مجبوری،آخری شکار،نئی قید،کارگر حربہ،خوشی، ہنسنا منع ہے،باعث تاخیر،ابتدائی حساب جمع تفریق ضرب تقسیم،ایک اور وصیت،،کتنی دور سے،درباری،وصیت کی رُو سے اور بہت کچھ اس شمارے میں۔

وضاحت۔قندیلِ اَدب انٹرنیشنل کسی سیاسی سماجی مذہبی گروہ یا فرقے کا ترجمان نہیں یہ نسل یا فرقوں کے امتیاز سے بالا تر ہے یہ صرف ادب کی ترقی و ترویج کے لئے جاری کیا گیا ہے۔اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں قارئین کو آراء یا مضامین سے اختلاف کا حق حاصل ہے اور اس کے صفحات حاضر ہیں۔تحریر کے ساتھ اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور ارسال کریں یہ آپ کا اپنا میگزین ہے۔

تبصرے۔

مکرم زکریا ورک صاحب کینیڈا سے تحریر فرماتے ہیں کہ قندیل ادب دھنک رنگوں میں بہت ہی خوبصورت ملا۔بہت ہی اچھا ہے۔

مکرم صفی الرحمٰن غوری صاحب پی ایچ ڈی امریکہ سے تحریر فرماتے ہیں۔قندیل ادب بہت اچھا لگا۔برائے مہربانی مجھے مسلسل بھیجتے رہا کریں۔**مکرم داؤد قریشی صاحب گلاسگو** سے لکھتے ہیں۔بہت معلوماتی اور دلکش ہے آئندہ نسلوں کے لئے بہت عمدہ کاوش ہے ۔جزاکم اللہ۔**مکرم شوکت نواز خان Leytonstone** سے لکھتے ہیں آپ کا رسالہ بہت ہی اچھا ہے میں نے سارا بہت دلجمعی سے پڑھا ہے۔بہت شکریہ۔**خواجہ عبدالمومن ناروے** سے لکھتے ہیں رانا صاحب آپ نے تو کمال کر دیا۔ماشاءاللہ بہت اچھی کوشش ہے۔

ثاقب زیروی۔۔۔رانا عبدالرزاق خاں

نام محمد صدیق ولد حکیم مولوی اللہ بخش قوم راجپوت وطن زیرہ ضلع فیروز پور (پنجاب بھارت) تاریخ پیدائش ۱۱۔اپریل ۱۹۱۹ء تاریخ وفات ۱۳ جنوری ۲۰۰۲ء بمقام لاہور۔قدرت نے ادبی وصف کا بیج روزِ اول سے ڈال دیا تھا آنرز ان اردو ۱۹۴۷ء میں اور بی اے ۱۹۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔"گنجینہ اردو" کے نائب مدیر بھی رہے جبکہ مدیر احسان دانش تھے۔پھر اپنے مرشد کے کہنے کے مطابق مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر جیسے کہنہ مشق صحافیوں سے تربیت حاصل کی۔کتب۔ ہندوستان کی مٹی (افسانہ)۔کاربنکل کی تشخیص۔ پنجابی میری زبان۔دورِ خسروی۔شہابِ ثاقب۔نویدِ منزل۔آہنگِ حجاز مجموعہ نعت رسول ﷺ ہے ۔ثاقب کی تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی ہے اس کی طبیعت میں شرافت،سعادت،شرم حضوری اور دیانت فکر و عمل کی بنیادیں گہری ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انہیں نوجوانی اور جوانی کے دونوں زمانوں میں کبھی بے نفسی بے راہ روی یا فکری آوارگی کا شکار نہیں ہونا پڑا۔اور وہ ہمیشہ بندھے ٹکے اسلوب زندگی پر کاربند رہے ہیں۔چنانچہ ان کی شاعری کو دیکھیئے فکر میں جدت تو ہے ابتذال نہیں دین اور حمیت دین تو ہے ملائیت نہیں۔عشق تو ہے لیکن فسق کا شائبہ تک نہیں،غریبوں کی مصیبتوں پر آنسو ہیں۔موجودہ نظام عدم مساوات کے خلاف طیش ہے۔لیکن کمیونزم نہیں۔یہی اعتدال کا رستہ اور یہی صراطِ مستقیم ہے۔خوش گل،خوش گلو،سروقامت،مقطع داڑھی،شیروانی پوش،ثاقب زیروی دلکش شخصیت کے مالک تھے۔اعلیٰ مشاعروں میں جہاں چیدہ لوگوں کا اجتماع ہو ثاقب زیروی اپنی

انفرادیت برقرار رکھتے تھے۔ وہ زندگی کے کسی بھی معاملے میں انتہا پسند نہیں تھے۔ وہ ہر اعتبار سے میانہ رو، سلامتی پسند اور غیر حاسد قسم کے آدمی تھے۔ ان کی یہی خصوصیت انہیں حلقہ احباب میں مقبول بنائے رکھتی تھی۔ ثاقب زیروی کا شاعر ہونا اور اس حد تک دھانسو شاعر ہونا تاریخ ادب کا ایک عجیب و غریب واقع ہے۔ عنفوانِ شباب میں ثاقب سب انسپکٹر تھے۔ لیکن کون جانتا تھا کہ یہی سب انسپکٹر شاعری کی دنیا میں مقبول خاص و عام ہو جائے گا۔ میاں محمد شفیع کہتے ہیں کہ ثاقب زیروی انجمن اسلام کے ایک جلسے میں موجود تھے جب ان سے شعر سنانے کی فرمائش کی گئی تو اپنے اشعار اور گداز ترنم کے بل پر پورے جلسہ پر چھا گئے اور اس دن سے ثاقب زیروی کے سامنے ایک اعلیٰ ادبی مستقبل اُجاگر ہو گیا۔ خلوص اظہار، سوز و گداز اور خیال و اسلوب کی ہم آہنگی ثاقب زیروی کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔ خاص طور پر ان کی نعتیں حضوری قلب کا بہترین اظہار ہوتی ہیں۔ اور اس مرحلہ پر اردو کے بہت شعراء ان کی برابری کرتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ثاقب زیروی طبیعت اور فکر کے اعتبار سے مذہب پرست ہیں اور وہ نعتیں خانہ پُری کے لئے نہیں لکھتے بلکہ احتیاج طبیعت اور طبعی رجحان کے ماتحت لکھتے ہیں۔ اور یوں ان میں صداقت، خلوص اور جذبہ کارچاؤ بھرپور انداز میں موجزن ہوتا ہے۔ ع ۔تو حبیبِ ربِ جلیل ہے تیری عظمتوں کا جواب کیا

تو مقامِ فخرِ خلیل ہے تیری حُرمتوں کا حساب کیا
کہاں تو کہ باعثِ کُن مکاں کہاں فکرِ ثاقبِ خستہ جاں
بلا مدحتِ شہ اِنس و جاں کرے مجھ سا خانہ خراب کیا

اس ایک نعت سے ہی ثاقب زیروی کے وفورِ جذبات اور عشقِ رسول کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ثاقب کے ہاں اسی قدر و نوعیت کی اور بھی کئی نعتیں بھی ملتی ہیں۔ ثاقب زیروی شعر و سخن کی عظیم رفعتوں پر فائز تھے اور خصوصاً نعت رسولؐ کے بارے میں اپنے عاشقانہ رنگ، جذبہ فدائیت، جدت استعارات، لطافتِ تخیل، تشبیہ کی خوبی، مضامین کی جامعیت، اور والہانہ اندازِ بیان میں آپ کا کلام اپنی نظیر آپ ہے۔ نعت گوئی کے وصف میں یکتائے روزگار تھے، عشق محمد ﷺ آپ کا سرمایہ حیات تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شمع حُبِ نبویؐ آپ کے دل و دماغ میں پوری آب و تاب سے روشن تھی۔ ثاقب زیروی کی نظمیں موضوع کے اعتبار سے متفرق اور متنوع ہوتی ہیں لیکن اس میدان میں ان کا جذبہ حُب الوطنی کے گرد گھومتا ہے۔ صبح دیانت، وطن، یاد دہانی اور مجاہد وغیرہ یہ تمام نظمیں ملکی حالات کے متعلق ہیں۔ المختصر ثاقب کی شاعری پاکیزہ باسلیقہ اور سلامت رو ہونے کے ساتھ ساتھ غنایت کی بھی حامل ہے۔ ان کی شاعری ایک اعلیٰ کلچرڈ کی طبیعت کی عکاسی کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں تاثر کا عنصر بدرجہ کمال پایا جاتا ہے اور ہر سامع ان کے اشعار سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ باکمال صاحبِ قلم پر، پُرشکوہ ستاویزی اشاعت شائع کرنا ہر ادارے کے لئے باعثِ فخر ہوتا ہے اور جس کی ۶۰ سالہ قلمی زندگی کی طویل صبر آزما جدوجہد کی داستاں کا احاطہ کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ پھر بھی کچھ سر پھرے ادبی مجنوں یا لوح و قلم کی پرورش کی مرض میں مبتلا اپنے خونِ جگر سے ادب کے لالہ زاروں کی آبیاری کر رہے ہیں۔ بقول شاعرِ مشرق۔ع نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر!

ثاقب زیروی جیسی شخصیت پر لکھنا اس لئے بھی دشوار ہے کہ بقولِ ثاقب صاحب کہ ''ہم جو تھے وہ نہیں رہے جو بننا چاہتے تھے وہ بن نہیں پائے'' ایسی شخصیت جس نے برصغیر کی ریاستوں کے عروج و زوال اور عزت دار گھرانوں کو گردشِ لیل و نہار کے باعث گم نام ہوتے دیکھا ہو۔ جس نے خاندانی خون کے الرغم قول و فعل کے تضاد کو دیکھا اور اپنے جذبات کو اشعار میں قلم بند کیا۔ ایسے شخص کے متعلق لکھنا اس لئے مشکل ہے کہ جس نے اپنی سیاسی بصیرت کو ہمیشہ فطرتی و کائناتی حقائق کے دائرہ سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ جس نے اعتدال کے ساتھ ساتھ محبت و بھائی چارے کے وسیع کینوس پر اپنے نقشِ محبت کو اپنے عمل سے ثبت کیا۔ جسے قدرت نے وصف عطا کیا کہ ''کسی کی تحریر کے چند فقرے اور گفتگو کے چند مکالمے اس کے معیارِ روفا کے نقش بن کر ثاقب صاحب کے ذہن میں اُجاگر ہو جاتے تھے اور اس نقش کے مطابق ثاقب صاحب نے جس سے جو بھی تعلق قائم کیا اس کو ہمیشہ اس پر نازاں رہا'' یہ محض ان کے خالق و مالک کا فضل تھا جس نے الفاظ کی پہچان اور ان کے اوزان کی صلاحیت انہیں ودیعت کی۔ اسی کے فیض نے ہمیں ایک اچھا مصنف، اچھا شاعر و ادیب عطا کیا اس کے علاوہ ایک انسان دوست دیا جو بے غرض اطاعت اور بے پایاں محبت کا مجسمہ شاہکار ثاقب زیروی کی شکل میں دیا۔ جس نے ہمیشہ اپنی تحریر لکھتے وقت ان باتوں کو مدنظر رکھا کہ ''اس فقرے کے ملکی حدود میں کیا معنی کئے جا سکتے ہیں اور ملکی حدود سے باہر کیا؟ میرے دین کے لئے کیا مفہوم رکھتا ہے اور بعد میں میری قوم پر کیا اثر چھوڑے گا ایسی مستند تحریر لکھنے والی شخصیت پر لکھنا کچھ آسان نہیں''۔ بانی ہفت روزہ ''لاہور'' ثاقب زیروی نے اردو صحافت کی اعلیٰ روایات کو جس طرح زندہ تابندہ رکھا۔ وہ اپنی جگہ مسلم لیکن وفا اور وضع داری کے اس پیکر کی ساری زندگی تا مرگ، ہر لحہ ایک ہی لگن اور ایک ہی مشن پر قائم رہی ''اعلیٰ دینی اقدار کا قیام و استحصالی نظام کا خاتمہ رہی۔ ثاقب زیروی صاحب سولو صحافت کا نادر نمونہ تھے۔ برصغیر پاک و ہند کی صحافت کی جب تاریخ لکھی جائے گی تو کوئی مورّخ آپ کے نام کا ذکر کئے بغیر آگے نہ بڑھ سکے گا۔ تن تنہا پچاس سال تک ہفت روزہ ''لاہور'' سورج کی سی باقاعدگی سے نکالتے رہے۔ ثاقب زیروی نہ جانے کیا شے تھے۔ وہ مقدمات بھی بھگتتے رہے مبارک بادیں بھی سمیٹتے رہے گالیاں بھی سنتے رہے، دعائیں بھی لیتے رہے، وہ مشاعروں کی جان تھے۔ بڑے بڑے مشاعروں میں شائقین کی آنکھوں کے تارے تھے۔ اور دلوں کی دھڑکن، وہ جہاں صاحبانِ اقتدار کا دوست تھے اسی طرح غریبوں کا مونس و غمخوار بھی وہ کبھی بڑے بڑے شاعروں کی موجودگی میں مشاعروں کو الٹ دیا کرتے تھے اور کبھی پٹے ہوئے مشاعروں کو جما دیا کرتے تھے ۔ان کی زندگی میں کئی نشیب و فراز بھی آئے مگر وہ ویسے کے ویسے ہی رہے۔ اُن کی

وہی آشیاں

کبھی ہم بھی تھے یونہی محترم کبھی ہم بھی اہلِ وقار تھے
یہیں ساتھ ساتھ تھیں بستیاں جہاں ہم بھی اہلِ دیار تھے

پھر کیا ہوا کہ ہوا چلی رُخ بادباں کے پلٹ گئے
رہی کشتیاں نہ ہی ناخدا نہ ہی وہ جو ان میں سوار تھے

کچھ تو بتاؤ بلبلو گلشن میرے کی داستاں
چُن چُن کے کس نے چُن لیے وہی گل جو فخرِ بہار تھے

ہوئے مبتلا تیرے عشق میں ہوشِ جاں رہی نہ قرارِ دل
تجھے کیا کہوں میری خامشی ارمان تو بے شمار تھے

نہ ہو بدگماں میری جانِ جاں وہی پیڑ ہے وہی آشیاں
جھولا نما وہی ڈالیاں تیری ہر خوشی پہ نثار تھے

ہم نے کہا تم ہو وہی اُس نے کہا تم وہ نہیں
ہم ہو گئے نادم ظفؔر سمجھے کہ وہ دلدار تھے

عبدالمجید ظفؔر

باتوں سے کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا وہ تہہ بہ تہہ کھلتے تھے مگر کم کم احباب پر۔اور جن پر کھلتے تھے اُن کو اپنی محبتوں اور شفقتوں میں سمیٹ لیا کرتے تھے۔اور وہ اُن محبتوں شفقتوں کا محور دیکھتا رہ جاتا کہ ایسا کس وجہ سے اور کیوں؟ آپ کے ہم عصروں میں فراق گورکھپوری، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، بابا کمل پوش، کلیم عثمانی، طفیل ہوشیار پوری، مولانا صلاح الدین، حکیم سعید، احسان دانش، ساغر صدیقی، سیف الدین سیف، مصطفےٰ زیدی، عدم، تاثیر، تبسم اسد ملتانی، کوثر نیازی، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، تلوک چند محروم، رام لعل، مولانا تاجور نجیب آبادی، جگر مراد آبادی، علامہ نیاز فتح پوری، سردار دیوان سنگھ مفتون، م۔ش۔مجید نظامی، ن۔م راشد، نذیر شیخ، دوست جالندھری، مجید لاہوری، مولانا ظفر علی خان، سردار راجندر سنگھ بیدی تھے۔جن کا گاہے گاہے ذکرِ خیر چلتا رہتا تھا۔ثاقب زیروی صاحب کی شخصیت اگر چہ نمایاں طور پر تبلیغ دین، شاعری، صحافت اور ادارت پر مشتمل تھی۔اس کے آگے دو پہلو تخصیص کے حامل یہ تھے کہ انہوں نے مشکلات کے باوجود اپنا مشنری ذوق ابلاغ عمر بھر جاری رکھا اور صحافت میں انہوں نے اردو صحافت کا سب سے مشکل پہلو ''یک رکنی'' صحافت کا اختیار کیا تھا۔دنیا کی کسی زبان میں بھی ایسی صحافت مشکل ترین ہی ہوتی ہے۔لیکن اس طرح کی صحافت اردو میں اس لئے خاص اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہے کہ مدیر کو باوصف نظریاتی اخلاص کے زندگی کے سبھی پہلوؤں پر یکساں گہرائی کی نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔جس کے لئے مشاہدے اور مطالعے کا ہمہ وقت مجاہد بننا لازم ٹھہرتا ہے اس روایت میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ''الہلال'' مولانا محمد علی کا ''ہمدرد'' مولانا حسرت موہانی کا ''اردوئے معلیٰ'' اتنی بڑی مثالیں ہیں کہ بعض دفعہ یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے۔کہ ثاقب زیروی صاحب نے ۱۹۵۲ء جیسے نامساعد حالات میں اپنے لئے اسقدر مشکل راستہ کیوں اختیار کیا۔لیکن ''لاہور'' کے پچاس سال گواہی کے لئے موجود ہیں کہ انہوں نے نہ صرف انتخابِ درس کیا تھا بلکہ پورے تقاضوں اور شان بان کے ساتھ اسکو پورا رکھا اور جو سابق رواج خلوصِ کار اور ذاتی پاکیزگی کا تھا اسے تابانی سے جاری رکھا۔ایسے دقیق مگر اوصافِ حمیدہ کے ساتھ ساتھ ثاقب صاحب سے ملنے والے تمام لوگ یہ بھی گواہی دیں گے کہ وہ شرح محمدؐیہ پر پورے طور پر تمام عمر کاربند رہے۔اور ساری عمر ایک سالک صوفی اور باعمل عالم کے طور پر گزاری۔ثاقب زیروی نے اپنی شاعری میں گل وبلبل، لب و رخسار، ہجر و وصال، شمع و پروانہ کا رونا نہیں رویا بلکہ انسان پر انسان کے ظلم کی داستان بھی بیان کی ہے۔انسان کی چیرہ دستیاں اور انسان کی مجبوریوں پر حاشیہ آرائی کی ہے۔ثاقب زیروی نے اپنی شاعری میں حسن و عشق کے ساتھ ساتھ غربت کے چھپے ہوئے ناسوروں کو بھی ننگا کیا ہے۔مذہب کے مقدس نام پر خوں ریزی کرنے والے جعلی مولویوں کو وطن دشمنوں کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ثاقب زیروی ایک درویش صفت شاعر ہیں۔اُن کے ساتھ ادیب، صحافی، اُمراء روساء کی خوشامد کر کے کروڑوں روپے، کوٹھیوں اور کاروں کے مالک بن گئے مگر ثاقب زیروی نے نہ کوئی کوٹھی بنائی اور نہ کوئی کار خریدی۔پاکستان بننے سے قبل وہ تحریک پاکستان کے صفِ اول کے مجاہد تھے اور پاکستان کے لئے انہوں نے شب و روز کام کیا۔اور ان کے بہت سے عزیز تقسیم کے وقت شہید ہوئے۔۱۹۵۲ء میں لاہور کی صحافت پر ایک ایک نئے روشن ستارے کی طرح طلوع ہوئے۔اور آدھی صدی تک لوگوں کے دلوں میں اپنی نثر، اور شاعری سے جگمگاتے رہے۔آخر شہابِ ثاقب بن کر ٹوٹے، فضا میں روشنی بکھیرتے ہوئے اپنی حسیں یادیں چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔اُن کے قلم میں جادو تھا۔دوست نواز، عظیم شاعر، باکمال صحافی، ہنس مکھ ساتھی، غمگسار رفیق، بہترین استاد و دوست تھے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہ مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر ویرانے پہ کیا گزری۔

عبیداللہ علیم

کوئی پیاس کہیں رہ جاتی ہے
کوئی لاکھ سمندر پی جائے
کوئی لاکھ ستارے چھو آئے
کوئی پیاس کہیں رہ جاتی ہے
کوئی آس کہیں رہ جاتی ہے
کوئی زیست کا ساغر بھرتا ہے
کوئی پھر خالی ہو جاتا ہے
کوئی لمحے بھر کو آتا ہے
کوئی پل بھر میں کھو جاتا ہے
کوئی پیاس کہیں رہ جاتی ہے
کوئی آس کہیں رہ جاتی ہے

چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں

عاصی صحرائی

چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں ۶ فروری ۱۸۹۳ء میں ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔یہ پاکستان کا ایک مشہور شہر ہے اس شہر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایسے لڑکے نے آنکھ کھولی جو بعد میں اپنے دور کا واحد قانون دان، جینئس ثابت ہوا۔ان کی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں مکمل ہوئی جبکہ بی اے کی ڈگری گورنمنٹ کالج لاہور سے لی ۱۹۱۴ء

میں انہوں نے کنگز کالج لندن سے قانون کی ڈگری اس اعزاز سے حاصل کی کہ نہ صرف وہ کالج میں سب سے نمایاں رہے بلکہ برصغیر پاک و ہند میں وہی سب سے پہلے شخص تھے جو اس اعزاز کے مستحق قرار پائے۔اپنے ہم عصر دوسری قابل قدر شخصیات کی طرح وہ Lincon inn's Bar کے لئے مدعو کئے گئے۔ پریکٹیشنیئر لائیر کی حیثیت سے انہوں نے اپنی مثالی قابلیت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بٹھا دیا۔چنانچہ بہت سے مشہور کیس انہی کے نام سے مشہور ہوئے۔ان کی خداداد ذہانت نے پاک و ہند کے مشہور سیاست دان سر فضل حسین کو بہت متاثر کیا۔جو خود بھی ایک نابغہء روزگار شخصیت تھے۔اور پنجاب یونینسٹ پارٹی کے بانی تھے۔ چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں نے ۱۹۳۰ء کی دہائی میں اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔اور پنجاب کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بنے۔اور پنجاب کے مسلمانوں کی بہبود کیلئے بے مثال کام کیا۔وہ قانون کے میدان میں ناقابل شکست پہلوان ثابت ہوئے۔انہوں نے جس میدان کا بھی رُخ کیا وہاں ہی اپنی قابلیت کی دھاک بٹھا دی۔ اور کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیئے۔گول میز کانفرنس میں بھی مسلمانوں کے سب سے کامیاب ترین اور فتح نصیب نمائندے فقط وہی قرار پائے۔اورانہیں قانون اور سیاست کے میدان میں عقل و دانائی کے لحاظ سے گاندھی اور جناح کے مقابلے کی شخصیت قرار دیا گیا۔۱۹۳۱ء میں انہیں آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر بنایا گیا۔اور گول میز کانفرنس میں بھی وہی مسلم لیگ کے واحد کامیاب ترین ترجمان کہلائے۔اور یورپین سیاست دانوں کی توجہ کا اس حد تک مرکز بن گئے کہ چرچل تک نے ان کی قابلیت کی داد دی۔اور ان کی اصابت رائے کو تہ دل سے قبول کیا۔ اپنی بے مثال عقل اور ذہانت سے انہوں نے حکومت کے ایوانوں کو بھی فتح کیا۔انہیں وائسرائے کونسل کی سیٹ پیش کی گئی۔ یہاں اعلیٰ سطح پر انتظامی کارنامے انجام دینے کا موقع ملا وائسرائے کے تحت ریلوے کے وزیر بنے۔پبلک ورکس لیبر اور لاء کے محکموں کے وزیر رہے۔ایک مختصر وقت کے لئے لیگ آف نیشنز میں برٹش انڈیا کے نمائندہ رہے۔۱۹۴۲ء کے بعد چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں انڈیا کی فیڈرل کورٹ کے جج بنائے گئے۔جو مملکت کے چیف جسٹس کے برابر عہدہ ہے۔اس کے بعد قائد اعظم کی ذاتی درخواست پر لبیک کہتے ہوئے ریڈکلف کمیشن میں پاکستان کے cause کے لئے نمائندہ بن کر پیش ہوئے۔افسوس کہ متعصب مولویوں نے جب فسادات پنجاب کی تحقیقاتی عدالت میں انتہائی ناشکرے پن اور مذہب دشمنی کا اظہار کیا۔تو جسٹس منیر نے مخالف ملاؤں کو سخت ڈانٹ پلائی۔اور بتایا کہ میں خود اس کمیشن کا ممبر تھا۔اور چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں نے جس بہادری شجاعت اور دیانت کے ساتھ پاکستان (باؤنڈری کمیشن) کا کیس لڑا اس پر شکریہ ادا کرنا عدالت اپنا فرض سمجھتی ہے۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کو قائداعظم نے چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں کو پاکستان کا وزیر خارجہ مقرر کیا۔یو این او کے دنیا بھر میں سب سے بہترین ایڈووکیٹ بن کر ظاہر ہوئے۔جہاں انہوں نے تیسری دنیا کے مسلمان ممالک کے مسائل پر بہترین نمائندگی کی۔جس سے تمام عرب ممالک ان کے احسان مند ہوئے اور اس عمل سے پاکستان کا نام دنیا میں روشن ہوا۔یہ چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں ہی کی قابلیت تھی کہ انہوں نے یو این او کو کشمیر کی آزادی کے لئے ریزولیشن تیار کرنے پر آمادہ کرنے پر کامیاب کوشش کی جو پاکستان کیس کی زبردست بنیاد بن گئی۔چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے لئے پہلے پاکستانی جج مقرر ہوئے۔یہ اعزاز آج تک کسی دوسرے پاکستانی کو نصیب نہیں ہوا۔وہ یو این او کی جنرل اسمبلی کے صدر بھی مقرر ہوئے۔ستمبر ۱۹۸۵ء میں ان کا لاہور میں انتقال ہوا۔وہ بے مثال مصنف بھی تھے۔انہوں نے سیرت وسوانح حضرت محمد ﷺ پر بھی ایک کتاب تحریر کی۔کئی کتب کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔اپنی یادداشتوں پر مشتمل ''تحدیث نعمت'' کے نام سے بھی کتاب لکھی۔پاکستان کو وجود میں لانے کے لئے ان کی عظیم الشان خدمات Glorios Contribution کی حیثیت رکھتی ہیں۔یہ خدمات متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے، پاکستان کے لئے اور تیسری دنیا کے مسلمانوں کے لئے تھیں۔قائداعظم کے بعد ان کی خدمات کو دوسرا درجہ دیا جاتا ہے جو وہ بطور محبّ وطن جیورسٹ ڈپلومیٹ ہونے کی حیثیت سے بجالائے۔جبکہ ان کے ہم عصروں میں نام نہاد خدمات کے بہت سے دعویٰ دار ایسے تھے۔جو بعد میں اس ملک کی تضحیک کرنے میں پیش پیش رہے۔جبکہ چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں اخلاقی لحاظ سے ہمیشہ ان تمام لوگوں سے بہت بلند رہے۔کبھی بھی اس عظیم انسان کی یاد کو قومی سطح پر نہیں منایا گیا۔اور نہ قومی سطح پر ان کی خدمات پر اظہار تشکر اور احسان مندی کا رویہ دیکھنے میں آیا جبکہ اس شخصیت کے ملک خداداد پاکستان پر گراں قدر احسانات ہیں۔اس کی یاد کو اذہان سے محو کرنے کی ہر ممکن کوشش اس لئے کی جاتی رہی کہ وہ شخصیت عقائد کے لحاظ سے احمدی تھا۔

خود کو پہچانئے ۔۔۔۔۔اے آر خاں

''ہر مردے دہر کارے'' کا تخیل موجودہ دور کے دنیوی نظام میں اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ آج سے ہزاروں سال قبل افلاطونی جمہوری نظام میں اہم تصور کیا جاتا تھا زندگی اور زندگی کی تمام ترنگینیاں، ذہن اور اس کی جملہ صلاحیتیں اس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتیں جب تک ہم زندگی کی پیچیدہ راہوں میں اپنا مقام یا نصب العین معلوم نہ کر لیں۔آج بھی سرزمین پاکستان میں بے شمار نوجوان ایسے ہیں جو عالمانہ رہبری کے فقدان کی بنا پر زندگی کے چوراہے پر کھڑے ہوئے اس شعر کی زندہ تفسیر بنے ہوئے ہیں۔چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ....پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں ترقی یافتہ ممالک میں نصب العین کا تعین قومی تعلیم کی اوّلیات تصور کیا جاتا ہے۔اگر

تعلیم کا کوئی مقصد ہے تو صرف یہ کہ حجاب در حجاب پردوں کو بے نقاب کرتے ہوئے آئینہ ایام میں ہمیں اپنی سچی تصویر دکھائے، تصورات کو مجردات کی شکل دے، جبلتوں کو حسن کے سانچے میں ڈھالے اور فرد کی فطری صلاحیتوں کے لئے ایک موزوں میدان ہموار کرے تا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو آلہ کار بناتے ہوئے اپنے میدان کا مرد ثابت ہو ۔آج جس شخص کو دیکھیئے اس کے ماتھے پر تین بل نظر آئیں گے۔ وہ قدم قدم پر کج خلقی کا مظاہرہ کرے گا اس کی وجہ یہ ہے کہ کہ ہمارے معاشرے میں ۹۹ فیصد افراد mental anarchy میں گرفتار ہیں۔ اور زندگی میں اپنے موجودہ مقام سے مطمئن نہیں ہیں۔ انہیں فردوس گم گشتہ کی تلاش ہے اپنے ذہنی رجحانات اپنے ذوق اپنی گہرائیوں اور گیرائیوں کا جائزہ لیجیئے اور خود سے سوال کیجئے۔ میں کیا بننا چاہتا ہوں؟ اگر آپ کے پاس اس کا جواب ہے تو سمجھ لیجیے۔ کہ آپ موزوں، متوازن، اور منتظم شخصیت کے مالک ہیں۔ ورنہ آپ ہر لحہ اپنی زندگی کو برباد کر رہے ہیں۔ آپ وہ جسم ہیں جس میں روح نہیں، آپ وہ پھول ہیں جس میں خوشبو نہیں۔ وہ مسافر ہیں جس کی کوئی منزل نہیں۔ وہ گم کردہ راہ ہیں جو ہر وقت کہیں ذہنی خودکشی اور کہیں شکستہ ضمیری میں گرفتار ہو۔ بقول غالب نہ تو آپ ''بوئے گل'' ہیں۔ اور نہ ''نغمہ ساز'' آپ صرف اپنی شکست کی آواز ہیں۔ سقراط کی پہلی اور آخری تعلیم ''خود کو پہچانئے'' کی تعلیم تھی .....باب العلم حضرت علی کرم اللہ کا یہ قول آج بھی دنیائے علم کا ایک روشن مینار بنا ہوا ہے اس قول کی معنویت ان ماہرین تعلیم سے پوچھیئے جو زندگی کے چھوٹے چھوٹے اور بڑے بڑے مسئلہ کو فرد کے ''عرفان نفس'' کی روشنی میں حل کرتے ہیں۔ اگر آپ زندگی کی جوہری طاقت سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہیں تو پہلے واضح طور پر اس امر کا فیصلہ کر لیجیئے کہ آپ کیا بننا چاہتے ہیں۔ جس طرح جہاز کے کپتان کے پاس بادپیما اور موسمیاتی معلومات اور قطب نما ہوتا ہے اس طرح ہر انسان کے پاس ایک قطب نما ہوتا ہے۔ جو اس کی منزل کی نشاندہی کرتا رہتا ہے۔ اس کو عام الفاظ میں ''اپنا اپنا ذوق'' یا ''اپنا اپنا رجحان'' کہتے ہیں۔ ہمارا رجحان طبعی ہی اصل میں اصل میں طباع بناتا ہے ۔زندگی کے نگارخانہ میں جا کر دیکھیئے۔ کہیں شاعر قوم کی آنکھ کا تارا بنا ہوا ہے۔ کہیں مصور قوم کی تصویر میں گم ہے۔ کہیں لیڈر قوم کا درد بنا ہوا ہے۔ کہیں استاد معمار اعظم ہے کہیں فنکار اپنے شہ پاروں میں گم ہے کہیں گلوکار اپنے نغمات میں محو۔ ان سب نے اپنے آنسوؤں سے اپنی زندگی کی تاریک رات میں چراغاں کیا ہے۔ اب سب نے اپنے خون جگر سے اپنی زندگی کی چمن بندی کی ہے۔ رومی، سعدی، خیام، فردوسی، بوعلی سینا، انوری، رازی سے لے کر غالب، حالی اور اقبال تک کی زندگیوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو ہمیں صرف یہی پتہ چلتا ہے کہ یہ بلند ہستیاں دُھن کی اور کام کی پکی تھیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اقبال کو اقبال کی بچپن ہی سے تلاش تھی۔ جب ہی تو اس نے سکول میں دیر سے آنے پر کہا تھا کہ ''اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے''۔ زندگی کے بازار میں ہر چیز کی ایک قیمت مقرر ہے۔ لیکن بہت سے لوگ زندگی کو ایک حسین تحفہ یا پھولوں کی سیج سمجھتے ہیں۔ اس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ زندگی ہر چوراہے پر انہیں بچوں کو کھلونے دے کر بہلا دیتی ہے۔ برخلاف اس کے مردان ہنرمند جنہیں صرف ایک ہی لو اور لگن ہوتی ہے وہ دن میں آفتاب کی کرنوں اور رات میں مہتاب اور تاروں کی ضوفشانیوں سے اپنی تصویر چمکاتے ہیں۔ یہ لوگ زندگی کے بازار میں گرمی خون سے سودا کرتے ہیں۔ ان کا مے خانہ حیات ان کے گرم لہو سے معمور ہوتا ہے۔ وہ اپنے ذوق کے نشہ میں سرشار ہوتے ہیں۔ اور اپنی منزل کی تلاش میں مردانہ وار جادہ پیما ہوتے ہیں۔ ہمارے محبوب قائد کو صرف ایک دُھن تھی۔ قوم کا صرف ایک مطالبہ تھا ایک نعرہ تھا ''پاکستان'' ہمارے مخالفین نے کہا جناح چاند تاروں کے لئے رو رہا ہے، جناح ناممکن کو ممکن بنانا چاہتا ہے۔ اور بے شک چاند تاروں سے حکومت کی تخلیق کی جو دنیا کی چاند تاروں والی حکومتوں میں سب سے بڑی حکومت ہے۔ ہمیں ہمیشہ اس ذہنی قانون کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ وحدت، مقصد، وحدت فکر کو جنم دیتا ہے۔ وحدت فکر، وحدت عمل کو جنم دیتی ہے اور غم زندگی میں جوہری طاقت کا دوسرا نام ہے۔ لیکن یہ میدان عمل یہ جوہری طاقت اس وقت تک ہیچ ہے جب تک ہم خود کو نہ سمجھیں۔ اور اپنی صلاحیتوں کو یکسوئی کے ساتھ کسی خاص مقصد کے لئے جو ہمارے لئے عین عبادت ہے آلہ کار نہ بنائیں۔

ہم وہی لوگ ہیں.....مبارک صدیقی

جن کی راہوں میں کانٹے بچھائے گئے
جن کے بستے ہوئے گھر جلائے گئے
وہ جو ہر دور میں آزمائے گئے
بے گناہ جو لہو میں نہائے گئے
ہم وہی لوگ ہیں، ہم وہی لوگ ہیں

وہ جو رسمیں وفا کی نبھا کے چلے
شہرِ جاناں کو سب کچھ لُٹا کے چلے
اپنے پیاروں کی لاشیں اُٹھا کے چلے
ہر قدم ضبطِ غم آزما کے چلے
ہم وہی لوگ ہیں، ہم وہی لوگ ہیں

وہ جنہوں نے جفاؤں کو مانا نہیں
چار دن کے خداؤں کو مانا نہیں
جبر کی انتہاؤں کو مانا نہیں
قاتلوں بے وفاؤں کو مانا نہیں
ہم وہی لوگ ہیں، ہم وہی لوگ ہیں

وہ جو قصوں کتابوں میں مشہور تھے
کلمہء حق جو کہنے پہ مجبور تھے
وہ جو سقراط تھے وہ جو منصور تھے

ہم وہی لوگ ہیں،ہم وہی لوگ ہیں
وہ جو حرفِ وفا معتبر کر گئے
یوں جلے شب نگر میں سحر کر گئے
وہ جو اُجڑے چمن با ثمر کر گئے
عشق اپنے لہو سے امر کر گئے
ہم وہی لوگ ہیں،ہم وہی لوگ ہیں

ڈاکٹر راشد متین

کیا بستی تھی کون گلی گھر بھول گیا
دستک دینا چاہی تو در بھول گیا
رنگ پکڑنے نکلا تھا جو تتلی کے
بچہ رستے کے سارے ڈر بھول گیا
وقت سے پہلے ہجرت کا اعلان ہوا
ایک پرندہ عجلت میں پر بھول گیا
سوم کلی نے کیاری میں انگڑائی لی
سورج بھی کرنوں کے نشتر بھول گیا
ہری ڈال اور بارش دونوں جوبن پر
میں کھڑکی میں آنکھیں رکھ کر بھول گیا
شیش بدن کا کوندا لپکا آنگن میں
اس کے بعد کا سارا منظر بھول گیا

دُھواں..... عامر امیر

زمین پر کھڑے ہو کر سر اوپر اٹھائیں تو نظر آتا ہے نیلا شفاف آسمان ،چمکتا سورج، چاند، ستارے اور ادھر اُدھر تیرتے بادلوں کے ٹکڑے۔ جو ہوا کے دوش پر سفر کرتے ہیں۔ یہ کائنات ہے اوپر جائیں تو آ،ان اور زمین کے درمیان خلا میں تیرتا آسمان، جب نظر نیچی کریں تو تو کتنا خوبصورت نظارہ ہے۔ گھر میں رہتے ہوئے یا منزلوں پر کھڑے ہو کر زمین کو دیکھیں تو یہ حسین نظارہ آپ کو کبھی نظر نہیں آتا۔ جو آپ اوپر سے سر جھکا کر دیکھتے ہیں۔ روئی کے گالوں کی طرح اُڑتے ہوئے بادل، سفید سرمئی اور کالے بادل جو ادھر اُدھر اٹھکیلیاں کر رہے ہیں۔ جب سورج کی شعائیں کہیں شگاف دیکھ کر باہر آنا چاہیں تو یہ بادل ایسے چمکتے ہیں کہ اس رنگ سے بہتر کوئی اور رنگ نظر نہیں آتا۔ چمکتی ہوئی چاندنی جو آنکھوں کو خیرہ کرتی ہیں اور بادلوں کی یہ کیفیت، دل چاہتا ہے کہ دونوں ہاتھ پھیلا کر جتنا یہ خوبصورت اور نرم چمکتا دُھواں اکھٹا کر سکیں کر لیں۔ بچوں کی طرح یہ دُھواں اور یہ نرم گالے اکھٹے کریں اور جمع کر کے اس سے پیارا سا گھر بنالیں۔ نرم نرم گدیوں کی طرح اس پر اچھلیں، کودیں، اور قہقہے لگائیں۔ تصور میں ماضی کے وہ دن جب مائیں رُوئی کو دھنکوا کر منگاتی اور رضائیاں بھرتی تھیں اور بچے اس روئی کو ہاتھوں میں سمیٹ کر گولے بناتے یا اس پر جان بوجھ کر اُچھلتے کودتے اس دُھواں دار اور نرم نرم تصورات سے ذرا پلٹیں تو یہ احساس ہوا کہ خدا تعالیٰ نے بھی تو ایسے ہی دُھواں کے متعلق اپنی کتاب میں بتایا ہے کہ قیامت کو آسمان اور پہاڑ سب دُھواں دُھواں ہو جائیں گے بالکل ایسے ہی سنہری۔ سرمئی اور سفید دھوئیں کی طرح اور اس پر چمکتی شعائیں ہر انسان کے اپنے اعمال ہونگے۔ وہی نیک اعمال جو خدا کو پسند ہونگے۔ بلکہ جن اعمال پر خدا تعالیٰ کے فضل و کرم کی شعائیں پڑیں گی وہی چمکیں گے۔ آج کے اس افراتفری کے دور میں جو دُھواں ہے ہر ایک کے اردگرد ہے۔ وہ لالچ، ہوس، خودغرضی اور آگے بڑھنے کا دُھواں ہے۔ اس دُھوئیں میں اب شامل ہو گیا ہے۔ بم کا دُھواں اور اس دُھوئیں میں انسانوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ جسموں کے ٹکڑے ہو رہے ہیں۔ ختم ہو رہے ہیں بچوں کے قہقہے، پیار بھری باتیں، آگے بڑھنے کی کوشش، ترقی کرنے کے حوصلے اور ہمتیں، ہم انہیں روند رہے ہیں۔ ہر طرف ان لڑائیوں کے دُھوئیں میں چیخ و پکار، آہیں، سسکیاں اور حسرت بھرے ارمان اس دھوئیں کے گرداب کا شکار ہو رہے ہیں کہیں آگ کا دُھواں، بم کا دُھواں، بھڑکتی ہوئی آگیں، یہ کیسی آگ ہے جو ایک دوسرے کے جذبات، احساس، پیار، محبتیں، خلوص سب ہی کو ختم کر رہی ہیں۔ نہ تو وہ بچوں کی کلکاریاں کسی کو بُرے ارادوں سے روک پا رہی ہیں۔ کسی کو بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھنے کا خیال نہیں۔ کسی کو کسی کے بڑھاپے کے سہارے پر ترس نہیں آ رہا۔ نہ کسی کی لاٹھی تھامنے کا خیال ہے۔ یہ آگ اور دُھواں پھیلانے کے لئے اپنی جانوں کو بھی اسی ہی آگ کا جزو بلا خوف بنا رہا ہے صرف منفی تربیت کے باعث سب کچھ کر گزر رہے ہیں۔ یہ کالے ناگوں کی طرح پھنکارتے بادلوں کا دُھواں جو ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔ خدا رحم کرے ان کالے دھوئیں کو پھیلانے والوں پر ،اور ہدایت دے

عقیل دانش

اس مریضِ غم غربت کو سنبھالا دے دو
ذہن تاریک کو یادوں کا اجالا دے دو
ہم ہیں وہ لوگ کہ بے قوم وطن کہلائے
ہم کو جینے کے لئے کوئی حوالا دے دو
میں بھی سچ کہتا ہوں اس جرم میں دنیا والو
میرے ہاتھوں میں بھی اک زہر کا پیالا دے دو
اب بھی کچھ لوگ محبت پہ یقیں رکھتے ہیں
ہو جو ممکن تو انھیں دیس نکالا دے دو
وہ نرالے ہیں کرو ذکر تم ان کا دانش

اپنی غزلوں کو بھی انداز نرا لا دے دو۔

انسان کی عمر۔۔ یونان کی کہانی ہے کہ جب زیوس دیوتا نے انسان کو پیدا کیا تو اس کی عمر بہت مختصر لکھی! جب سردی کا موسم آیا تو انسان نے اپنی عقل استعمال کرتے ہوئے اپنے لئے ایک مکان بنایا۔ایک دن ایک گھوڑا سردی اور برفباری سے تنگ آکر انسان کے پاس آیا اور پناہ مانگی۔انسان نے شرط لگائی کہ کہ وہ تب پناہ دے گا اگر وہ اپنی عمر کا ایک حصہ اسے دے۔گھوڑے نے یہ شرط منظور کر لی۔کچھ ہی دنوں بعد ایک بیل موسم سے پریشان ہوکر انسان کے پاس آیا۔انسان وہی شرط سنائی اور بیل نے منظور کر لی۔آخر میں ایک اَدھ موا کتا سردی سے کپکپاتا ہوا اور انسان کی شرط منظور کرتے ہوئے مکان میں پناہ گزیں ہوا۔اس لین دین کا نتیجہ یہ ہوا کہ زیوس دیوتا کی عطا کردہ مختصر عمر کے دوران انسان خوش اخلاق اور پاک صاف رہا مگر جب انسان نے گھوڑے کی عطا کردہ عمر کا استعمال کیا تو وہ مغرور اور خودسر ہوگیا، جسے قابو میں لانا مشکل تھا، جب وہ بیل کی عمر کو پہنچا تو وہ مدبر اور سنجیدہ ہوگیا اور عمر کی آخری منزل پر جب وہ کتے کی عطا کردہ عمر کو پہنچا تو وہ بد دماغ اور چڑ چڑا ہوگیا کاش وہ زیوس دیوتا کی عطا کردہ عمر پر ہی اکتفا کرتا۔

عاصی صحرائی

بدوں اس کے اب آرام نہیں آتا
وہ شخص جس کا مجھے نام بھی نہیں آتا
سارا دن گزرتا ہے انتظار میں اس کے
اتنا لا پرواہ ہے کہ سرِ شام بھی نہیں آتا
اس کی نظروں سے مدہوش ہو ں اسقدر
وہ پلاتا ہے مگر بدست اسکے نظر جام بھی نہیں آتا
اس کی شکل مجھے چاند سی لگی
وہ ماہِ کنعاں جو لبِ بام بھی نہیں آتا
کروں کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا
چرا کے خواب وہ آنکھوں کو رہن رکھتا ہے
اور اس کے سر کوئی الزام بھی نہیں آتا

عورت کا جغرافیہ.....اے آر راجپوت

وجودِ زَن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دَرُوں

تمہید۔ دراصل عورت کی تمہید باندھنا گویا موت کو دعوت دینا ہے۔آ بیل مجھے مار۔ویسے اب تمہید کی چنداں ضرورت بھی نہیں رہی جوں جوں وقت گزرتا جارہا ہے۔عورت مجسم ایک اشتہار بنتی جارہی ہے۔اور کوئی مسخرا کہے ''کہ نہیں'' ہے مگر ''نہیں'' اور ایسے نہیں جیسے تلوں میں تیل ہوا کرتا تھا۔بلکہ ایسے ہے جیسے کلنک کا ٹیکہ۔روزمرّہ کے مشاہدات سے واضح ہوگیا ہے کہ عورت بحرِ منجمد شمالی سے لے کر بحرِ منجمد جنوبی تک۔ہر طول بلد سے ہر عرض بلد پر واقع ہے۔اور اس طرح واقع ہے کہ باید وشاید! ماہرین تاریخ کی پیشگوئی ہے کہ اگر یہی رفتار رہی تو کچھ عرصہ بعد دنیا میں عورتیں ہی ہونگی۔مرد کا شمار آثار قدیمہ کے عجائبات میں ہوگا۔.....رہے نام اللہ کا۔اور یہ ایک زریں دور ہوگا۔کیونکہ نہ رہے گا بانس نہ بجے کی بانسری۔

محل وقوع۔ مردوں کا دعویٰ ہے کہ ان کا محل وقوع حضرت آدمؑ کے قریب ہے۔اور عورتوں کا محل وقوع مائی حوّا سے وابستہ ہے۔لیکن یہ ایک طرح کی غلط فہمی ہے۔جو مردوں نے عورتوں کو احتیاطاً ڈال رکھی ہے۔تاکہ عورتیں اپنے آپ کو کمزور تصور کرتی رہیں!''عورت'' مرد کی سرد جنگ سے ہر گھر میدانِ کارزار بنا رہتا ہے۔کیونکہ عورت کا دعویٰ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے مرد کے برابر ہے۔اس تشویشناک نعروں سے ثابت ہوگیا عورت ہی دراصل ''مرد ہے۔مرد تو محض عورت ہے۔کافی عرصہ قبل یہ رو چلی تھی کہ فلاں مرد عورت بن گیا ہے۔اور فلاں عورت مرد۔مگر آج کل بھی یہ اکا دُکا واقعات رونما ہو رہے ہیں۔**حدود اربعہ۔** مردوں نے ہر چند زور لگایا کہ عورت کا حدود اربعہ بھی ہو۔لیکن اس میں کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔

آب و ہوا۔ عورت کی آب و ہوا کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔مشاہدات یہ بتلاتے ہیں ''اوائل عمر میں آب و ہوا سرد خشک ہوتی ہے بگولے چلتے ہیں اور آندھیاں بکثرت آتی ہیں''۔درمیانی عمر میں گرم مرطوب ہوجاتی ہے۔طوفان آتے ہیں۔بعض اوقات اولے پڑتے ہیں جس کے بعد بعض غیرت مند سر منڈوا لیتے ہیں اکثر بجلیاں کڑکتی ہیں اور بار بار گرتی ہیں۔کئی بار سرد لہر آتی ہے جس کے باعث مردوں کے دانت کڑکڑانے لگتے ہیں۔

پیداوار۔ کچھ لوگ تو خاوند کو بھی عورت کی پیداوار سمجھتے ہیں دلیل یہ ہے کہ اگر عورت نہ ہو تو خاوند کیسے ہوسکتا ہے۔اس مسئلہ پر زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں کیونکہ آجکل مرد ہوتا تو ہے لیکن برائے نام سا۔اس کا ہونا نہ ہونا ایک برابر ہے ہاں بچے ہوتے ہیں اور خوب ہوتے ہیں۔**طبعی حالات۔** شادی سے قبل والدین کے لئے ایک دردِ سر بنی رہتی ہے شادی ہونے کے بعد خاوند کا ایسا بخیہ ادھیڑتی ہے کہ غیر شادی شدہ شادی کا خیال ترک کر دیتے ہیں۔

تقسیم۔ عورتوں کی کئی قسمیں ہیں۔بلکہ ہر عورت بذات خود ایک نئی قسم ہے۔اور ہمارا تجزیہ یہ بتلاتا ہے کہ ایک ہی عورت کے اندر کئی کئی عورتیں بیک وقت پوشیدہ ہوتی ہیں۔اس کی تین اقسام ہیں۔اول۔اس قسم کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کے پیچھے خاوند

دُم چھلا بنا رہتا ہے۔ یہ اس قدر ''میک اپ'' کرتی ہیں کہ ان کی اصل شخصیت ناپید ہو جاتی ہے۔ اس فن میں ان کو اس قدر کمال حاصل ہوتا ہے کہ بڑے بڑے ماہرین یہ بھی معلوم نہیں کر پاتے کہ اس چہرے کے پیچھے کس کا چہرہ ہے۔ انکی پہچان یہ ہے ۔''انداز زنانہ چال مردانہ۔ گفتگو خاوندانہ، شانِ قلندرانہ، اگر خاوند کبھی کنایتاً برقعے کا ذکر چھیڑ بیٹھے تو ازالہ حیثیت عُرفی کا مقدمہ کرنے پر تل جاتی ہیں'' دوسری عورتوں کو نفرت سے دیکھنا اپنا فرض منصبی سمجھتی ہیں۔

نیم پوش۔ یہ خاتون اور برقعہ پوش کے بیچوں بیچ ایک مخلوق پیدا ہوئی ہے اور مشرق و مغرب کے امتزاج کی نسبت سے اسے ''پیوندی عورت'' کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا نرالا برقعہ پہنتی ہیں کہ ہر چند کوئی کہے کہ ''ہے'' مگر ''نہیں'' ہے۔۔ پھر درزیوں کے ہاں ان کی کانٹ چھانٹ کی جاتی ہے زیادہ تر انگریزی اسکولوں کالجوں میں پائی جاتی ہیں۔ گھر میں بیٹھنا ان کی شان کے خلاف ہے۔ برقع سیاہ پہنتی ہیں۔ مگر باریک تا کہ اندر سے کپڑوں کے رنگ یا ڈیزائن نظر آئیں ۔ اکثر تو جینز پہنتی ہیں ۔ عورت آزادی کے نام پر، محرومی کے نام پر، مظلومیت کے بہانے، حقوق نسواں کے بہانے ، آج کل اکثر ممالک میں مردوں کو لتاڑ کر زیادہ حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہو رہی ہیں۔ مغرب میں تو مرد بھیگی بلی بن کر رہ گیا ہے۔ کسی بھی مقدمے میں قصور بھلے عورت کا ہی ہو مگر فیصلہ پھر بھی عورت کے حق میں ہی ہوتا ہے

انسانوں کے تین گروہ۔۔۔۔۔۔راجہ منیر احمد

یہ بات بڑی واضح ہے کہ کہ مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا ہے جو نظریاتی بنیادوں پر اسلام کو اپنے دل میں جگہ دیئے ہوئے ہے جبکہ دوسرا گروہ اسلام کے اصولوں پر تو عمل پیرا ہے لیکن اس کی اخلاقی تعلیم سے کوسوں دور ہے۔ اسلام ان دونوں گروہوں سے بریت کا اعلان کرتا ہے۔ یہاں ایک تیسرا گروہ بھی ہے جو اسلام کو اپنانے کے ساتھ ساتھ اسکی تعلیم پر بھی عامل ہے۔ پھر اس کا ظاہر اس کے باطن کی مانند ہوتا ہے۔ اس راہنمائی کے مطابق جس کی طرف اسلام بلاتا ہے تا کہ شخصیت معتدل ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کے سارے پہلوؤں کو اپنے اندر جذب کر سکے اور یہی حقیقی اسلام ہے جسکی رہنمائی میں کتاب وسنت ملتی ہے اسلام عقیدے اور بہتر رویے کا نام ہے چونکہ دین کے مقاصد سے حق کی پہچان ہے جو کہ کتاب وسنت سے ہوسکتی ہے پھر انسان کے لئے ضروری ہے کہ کہ اس حق کے اوپر استقامت اختیار کرے یہ وہ حق ہے جسکے حصول کی دعا ہر مسلمان اپنے رب سے مانگتا ہے۔ اور نماز میں عرض کرتا ہے۔ ''ہمیں صراط مستقیم پر چلا'' پس جب وہ حق کی پہچان اعمال میں راسخ ہو جاتی ہے۔ تو اس کا اثر صاحبِ عمل میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ صاحبِ عمل انسان اس سے خیرِ کثیر حاصل کرتا ہے۔ اور اس کے ذریعے جنت کی ابدی نعماء کو حاصل کرتا ہے۔ اصل میں انسانوں میں تین گروہ پائے جاتے ہیں۔ پہلا گروہ تو وہ ہے کہ جس کے دل میں عقیدہ گھر میں پڑی کسی بوسیدہ چیز کی طرح ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ اسکے جذبات کی تحریک کا باعث نہیں بنتا۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے دل میں کوئی چیز موجود ہی نہ ہو تو دل میں اس نظریے کے احیاء کی از سرِ نو ضرورت ہے۔ اس گروہ کے نزدیک دین بندے اور رب کے درمیان روحانی تعلق کا نام ہے اور یہی اصل مقصد ہے۔ اور اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت نہیں اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کا دل پاک اور صاف ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد اس پر کچھ فرض نہیں۔ اور نہ ہی اسے لعن طعن کی جاسکتی ہے۔ اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو مذکورہ بالا خیال زعم باطل ہے۔ اس طرح انسان اپنے رب کو کس طرح راضی کر سکتا ہے۔ کیونکہ بندے اور رب کے درمیان تعلق ایک درخت کی طرح ہے اگر درخت پھل دار ہی نہ ہو تو اس کا کیا فائدہ؟۔ انسان اپنے دل کو پاک صاف رکھتا ہے۔ تا کہ یہ پاکیزگی اس کے عمل میں ظاہر ہو۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے کہ ایمان دل میں ہوتا ہے۔ اور اسکا اثر عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ جہاں تک دوسرے گروہ کی بات ہے اس کا عقیدہ درخت کی مردہ شاخ کی مانند ہے اس نظریے کے حامل افراد فرائض کی پابندی تو کرتے ہیں لیکن ان کے معاملات میں حلال وحرام کی کمائی، جھوٹ، بدخوئی، اور چغل خوری شامل ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کے دل میں حسد، کینہ، نفرت اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے کے جذبات ہوتے ہیں ۔ یہ گروہ دنیا کے سامنے اپنے آپ کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرتا ہے۔ لوگوں کے سامنے اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے۔ لیکن اللہ کے حقوق کی ذرا بھر پرواہ نہیں کرتا اس طرح اللہ سے کئے ہوئے وعدے کو وہ توڑ دیتے ہیں۔ اور اللہ سے اجرِ عظیم لینے کی بجائے لوگوں سے بہت کم اُجرت پر راضی ہو جاتے ہیں۔ مذکورہ بالا دونوں گروہ اپنے نظریے کے سراب میں گم ہیں۔ دین کے ایک پہلو پر عمل کرتے ہوئے دوسرے پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ حق پر عمل کے لئے اپنے آپ کو از سرِ نو تیار کریں۔ ورنہ اسلام ان کے کسی عمل کی تائید نہیں کرے گا۔ رہ گئی تیسرے گروہ کی بات تو وہ ایسے لوگ ہیں جنکے دل اللہ کے نور سے منور ہوتے ہیں اور ایمان انکے پورے جسم میں سرایت کر جاتا ہے۔ اہ اعمال کا نور ان کے اعمال سے ظاہر ہوتا ہے۔ پھر وہ عقلِ سلیم اور نفس مطمئنہ کی قوت سے غور وفکر کرتے ہیں غرباء اور محتاجوں پر مہربان رہتے ہیں۔ انکا عمل اخلاص سے بھرپور ہوتا ہے۔ کسی بھی انسان کو کوئی ایذا نہیں دیتے۔ ایسے لوگ دوسروں کے لئے زندگی گزارتے ہیں۔ یہ گروہ ایک طرف تو اللہ کی رضا تلاش کرتا ہے دوسری طرف لوگوں کی بھلائی سوچتا ہے ایسے ہی گروہ کے لئے حضور ﷺ نے فرمایا ''مومن محبت کرتا ہے اس سے محبت کی جاتی ہے اور سب سے بہتر وہ انسان ہے جو دوسروں کے لئے نفع آور ہو'' دین کی حقیقی سمجھ کے لئے ضروری ہے کہ ہم حقیقی سمجھ رکھیں۔ اور اس بات پر یقین رکھیں۔ عبادات کے ساتھ ساتھ معاملات انسانی اور اخلاق طیبہ بھی دین کے اندر شامل ہیں۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے کہ دین کے ستر شعبے ہیں۔ یہ ایک مسلمان کی زندگی میں توحید کے اقرار سے لیکر اخلاق تک شامل ہیں۔ مثلاً راستہ سے پتھر ہٹا دینا بھی ایمان ہے۔ پس مسلمان

کو اسی انداز میں دوسروں کے لئے نمونہ بننا چاہیئے چونکہ معاملات کا تعلق حقوق العباد کے ساتھ ہے تو اس میں انتہائی احتیاط کا رویہ اختیار کرنا ہوگا۔حلال وحرام کی تمیز،مشتبہ اشیاء سے دوری،اور اپنے آپ کو حقیقی اسلام کے ساتھ پیش کرنا ہوگا۔اسلام کا حسن اس میں ہے کہ انسان کا ظاہر و باطن ایک جیسا ہو۔اس کی بات دل کی ترجمان ہو،چونکہ مومن اس بات پہ ایمان رکھتا ہے کہ اللہ کی ذات ہر وقت اسے دیکھ رہی ہے تو وہ اپنے رب سے حیاء محسوس کرتا ہے۔کہ وہ ایسی بات کہے جو اس کے دل میں نہ ہو کیونکہ حیا ہی ایمان ہے۔

آدم چغتائی

صحرائے درد کی یہ روایت عجیب ہے
اِحساس راہنما ہے محبت نصیب ہے
خضرِ رہِ وصال کے جو بھی قریب ہے
راہِ وفائے عشق میں وہ خوش نصیب ہے
یہ فاصلوں کی بات نہیں نسبتوں کی ہے
جتنا ہے کوئی دور وہ اتنا قریب ہے
اُس بے مثال حُسن سے ہیں کیسی نسبتیں
اُن نسبتوں سے ہر کوئی میرا رقیب ہے
مُودہ دیا ہے جس کے لبوں نے حیات کا
وہ شخص ہی بہارِ چمن کا نصیب ہے
ہم نے وفورِ شوق میں کی اُن سے دوستی
راہِ وفا میں عشق ہی اپنا حبیب ہے
ملتا ہے غم کسی کو کسی کو مسرتیں
ہر شخص کا جدا جدا اپنا نصیب ہے
آدم سفر کا کرب اُٹھا کر نہ اُف کرو
کیا سوچنا کہ دن ہے کٹھن، شب مہیب ہے

ماں

ترے مقام میں کیا کمال رکھا ہے
ترے نام میں حسن و جمال رکھا ہے
تری جبیں ہے چاند کی مثل روشن
سراجِ منیر کی بنا کے مثال رکھا ہے
تمہارے چہرے پہ قرآن مسکراتا ہے
تمہیں خدا نے محبت میں ڈھال رکھا ہے
سجا ہوا ہے شرافت کا تاج سر پہ ترے
جسے محبت نے بڑھ کر سنبھال رکھا ہے
تیرے چہرہ اقدس پہ آئینوں کا وجود
مرے خدا نے تجھے بے مثال رکھا ہے
یہ ماں کی ہستی ہے جس میں خدائے وجیہ نے
خود اپنے نور کا حسن و جمال رکھا ہے
یہ مرتبہ بھی کوئی کم نہیں مرے عاصیؔ
کہ ماں کے قدموں میں جنت کو ڈال رکھا ہے

اچھی ماؤں کی ضرورت ۔۔۔۔۔ایاز راٹھور

حالیہ ایک مجلس مذاکرہ جس کا موضوع ''اکیسویں صدی میں عورت کا مقام'' تھا۔اس کے اختتام پر کہا گیا کہ نئی صدی کو اچھی ماؤں کی ضرورت ہے۔عورتوں میں اعتماد پیدا کیا جائے۔عورت ایک حقیقت ہے۔اتفاقی یا حادثاتی طور پر نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر تخلیق کی گئی ہے۔ان بیانات کو پڑھ کر حیرت ہوئی کہ آئے دن اخبارات کے رنگین صفحات اور ٹی وی کے اشتہارات،خواہ کسی قسم کا ہی اشتہار کیوں نہ ہو عورت ضرور دکھائی جاتی ہے۔معاشرے کا گہری نظر سے مشاہدہ کریں۔خواہ ایئر لائن ہو،کارپوریشن،بینکاری یا کھیت کا کام ہو،زندگی کے ہر موڑ پر اور ہر سفر میں عورت اعتماد کے ساتھ کام کرتی دکھائی دیتی ہے۔ہمیں نیک سیرت اور سلیقہ شعار ماؤں کی ضرورت ہے۔جنہوں نے محمد علی جوہر،مولانا حسرت موہانی،جیسے فرزندان اسلام کی تربیت کی۔ایسی مائیں چاہئیں جنہوں نے قائداعظم،چودھری ظفراللہ خان،ڈاکٹر عبدالسلام اور اقبال جیسے مدبران کی تربیت اور پرورش کی۔حالانکہ یہ مائیں جدید تعلیم و آسائش و آرام سے بھی آراستہ نہ تھیں۔یہ مائیں گھروں میں رہ کر بغیر اخبارات کی زینت بنے،اچھی اور قابل فخر مائیں تھیں۔آج کی ماڈرن عورت اور وسیع تر مفادات کا نظریہ نصب العین بنانے والی عورت دوسری عورت کو حقوق دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔کبھی ان کے گھریلو ملازمین اور کام کرنے والی عورتوں سے پوچھیئے تو انکے اندرونی،محبت،صبر،حسن سلوک ان کے خوبصورت میک اپ کے برعکس دکھائی دیتے ہیں ان کی لگائی ہوئی خوشبو بدبو محسوس ہوتی ہے۔ہمیں تو وہی اَن پڑھ،سلیقہ شعار اور دین دار مائیں ہی قبول ہیں۔جن کی گود سے پرورش پانے والوں نے ہمیشہ انسانیت کی بھلائی کے لئے اور بنی نوع انسان کی پاسداری کے لئے کبھی مصلحت کے تحت بھی سودا بازی نہیں کی۔رہا یہ کہ عورت ایک حقیقت ہے۔اتفاقی یا حادثاتی طور پر نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر تخلیق کی گئی ہے۔حیرت ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کی تعلیم بغور نہیں پڑھی۔اور آنحضرت ﷺ نے عورت کو آبگینہ سے تشبیہ دی۔مغرب نے جو عورت کو نام نہاد آزادی دی ہے۔اس میں اس کی عصمت کو سرعام نیلام کر کے رکھ دیا ہے۔اپنے میک اپ کے نام پر وہ ایک دن کا چوتھائی وقت صرف اپنے جسم پر خرچ کرتی ہے۔مرد سے برابری کی سوچ نے اسے حد

درجہ احساس کمتری کا شکار کر دیا ہے۔آزادی کے چکر میں دونوں اول تو اولاد سے محروم ہو چکے ہوتے ہیں۔اگر ایک آدھ بچہ پیدا بھی ہو جائے تو حقوق اولاد اور فرائض سے غافل ہو چکے ہیں۔اور پھر جب اولاد ان دونوں ماں باپ کا رہن سہن، دکھاوے کی محبت، بات بات پر مساویانہ حقوق کی بحث، اور قانونی چارہ جوئی وغیرہ کا مشاہدہ کرتی ہے تو ان سے جلد ہی کنارہ کشی اختیار کر لیتی ہے۔اس طرح یہ معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا ہے۔

فرخندہ رضوی

بے نور سمندر میں پڑا ہے کیسے
آفاق پہ یہ چاند چھپا ہے کیسے
مجھ کو بھی یہی فکر لگی ہے اب تو
وہ شخص مجھے بھول گیا ہو جیسے
سب لوگ ترقی میں لگے ہیں تو پھر
برباد سبھی شہر ہوا ہے کیسے
ظلمت سے نہیں کوئی تعلق تیرا
دامن پہ ترے داغ لگا ہے کیسے
ہر سمت چراغوں کے اُجالے ہیں پھر
دل میرا سرِ شام بُجھا ہے کیسے
فرخندہ خزاں کا ہی اگر ہے موسم
گھر میرا گلابوں سے سجا ہے کیسے

سیّد معراج جامی

تجھ سے جو منسوب ہوئے
خود سے بھی محبوب ہوئے
کون ہے جس کی خاطر ہم
دنیا میں معتوب ہوئے
کس کی طلب ہے اس دل میں
کس کے ہم مطلوب ہوئے
لب پر کس کا نام آیا
آنسو سب مکتوب ہوئے
وہ محبوب ہمارے ہیں
ہم کس کے محبوب ہوئے
مکرو ریا کی دنیا میں
آخر ہم مصلوب ہوئے
کس کا جلوہ دیکھا ہے
جامی کیوں مجذوب ہوئے

سعادت سعید کی ''کتابِ عذاب'' کا ایک ورق

رات

ہولناک اس زفیل جیسی ہے
جس سے کارواں ٹھہرے
جس سے گھونسلے اُجڑے

ذات

کجکلاہی میں مست فیل جیسی ہے
جس پو حملہ آور ہو مُور
جس کی آنکھ ہے بے نُور

مات

بے گناہی میں اس قتیل جیسی ہے
بے ثباتی میں اسرافیل جیسی ہے

گھات

آدمی خس و خاشاک
خاک میں ملے افلاک

یہ بے چارے شاعر۔۔اِبن لطیف

شاعر کی جمع شاعر ہی ہے کیونکہ کوئی شاعر اپنے علاوہ کسی اور کو شاعر نہیں مانتا۔مگر جہاں بہت سے شاعر اکٹھے ہو جائیں تو اسے مشاعرہ کہتے ہیں۔لندن میں مشاعرے کثرت سے ہوتے ہیں۔اس سے آپ شعراء کی تعداد کا اندازہ لگا لیجیے۔ان مشاعروں میں سامعین سے شعراء زیادہ ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کو اپنا اپنا کلام سنا کر باہم داد وصول کرتے ہیں۔یہ داد بھی ایک ہاتھ دے اُس ہاتھ لے والی ہوتی ہے اور حساب ہال کے اندر ہی بے باک ہو جاتا ہے۔کیونکر وہی شاعر جو ہال کے اندر واہ واہ کے نعرے مارتے ہیں گھر پہنچنے تک دوسرے شعراء کے کلام میں کیڑے نکالتے جاتے ہیں۔ہر شاعر دوسرے شعراء کی شاعری میں وزن، بحر، ردیف اور قافیہ کی کمی بیشی پر کچھ نہ کہے تو اس کی شاعری خطرے میں پڑ جاتی ہے۔شاعر بہت امن پسند ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ گھر کے ایک کونے میں تنہا بیٹھے سوچتے اور لکھتے رہتے ہیں۔اور گھر کے معاملات میں کم مخل ہوتے ہیں، گھر والے عموماً بوڑھوں سے الرجک ہو جاتے ہیں کیونکہ بوڑھے عموماً نکتہ چیں ہوتے ہیں مگر شاعر وہ بوڑھا ہوتا ہے جو کبھی قافیئے کے کھنور سے باہر نکل نہیں پاتا۔بے چارہ گھر والوں کے لئے کیا باعث پریشانی ہوگا۔لوگوں میں بیٹھا ہوا شاعر فوراً پہچانا جاتا ہے۔اپنے بکھرے ہوئے بالوں کی وجہ سے نہیں، ذہنی عدم موجودگی

کی وجہ سے، وہ اپنی نئی غزل کے اشعار پر سر ہلا رہا ہوتا ہے۔ اور مخاطب سمجھتا ہے کہ وہ اس کی باتوں پر سر دُھن رہا ہے۔ شاعر کا بس چلے تو وہ سرحدوں پر تعینات فوجوں سے ٹینک، توپیں اور بندوقیں لے کر انہیں اپنی غزلیں اور نظمیں تھما دے کہ جاؤ ان سے کام چلاؤ۔ ہر شاعر یہ سمجھتا ہے کہ جہاں وہ رہتا ہے وہاں اس کے کلام کو کوئی قدر نہیں کرتا۔ یا اس کے کلام کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ ہر شاعر اپنے سامعین کو اس طرح دیکھتا ہے جس طرح گویا وہ اپنے سازندوں کو دیکھتا ہے۔ لندن میں کئی ایسے شاعر بھی ہیں جو جو اپنے ہی منعقد کئے ہوئے مشاعروں میں اپنے آپ کو ایک دو سرٹیفکیٹ، القاب اور شیلڈز وغیرہ سے نواز دیتے ہیں۔ اور اپنے لکھے ہوئے قصیدے کو کسی بھولے بھالے شخص سے پڑھوا کر اپنے نام کو اونچا کر لیتے ہیں۔ لندن میں تو مشاعروں کی بھی درجہ بندی ہے۔ جن مشاعروں میں صرف چائے بسکٹ ہوں اس کی حاضری کم اور جس میں بریانی، نان کباب یا مرغ پلاؤ ہو تو وہاں کرسیاں کم پڑ جاتی ہیں۔ مشاعرے کے ہر اعلان کے آخر پر یہ ضرور لکھا ہوتا ہے ”کھانے کا معقول انتظام ہے“ ورنہ خدشہ ہوتا ہے کہ لوگ کم آئیں گے۔ کئی شعراء نے ایسی تنظیمیں بنائی ہوئی ہیں جن کے تمام اخراجات مشاعروں کی شکل میں مقامی کونسل کی گرانٹ سے پورے ہو جاتے ہیں بلکہ اکثر کے تو کئی دیوان بھی ان گرانٹس سے چھپ گئے ہیں۔ پھر لندن کی ایک تنظیم کو مقامی لائبریری کا ہال مفت کیا ملا کہ اب ہر تنظیم کا بانی اپنی لوکل لائبریری کے ہال پر حق جتاتا ہے۔ ملاؤں کی طرح شعراء کے بھی گروپ ہوتے ہیں جو اپنے گنے چنے سامعین کو مخالفین کے مشاعروں میں جانے سے روکتے ہیں۔ جب سے انگلینڈ میں بیروزگاری بڑھی ہے۔ یہاں شعراء میں بہت اضافہ ہوا ہے جہاں بوڑھوں سے مساجد کی رونق بڑھی ہے وہاں ان سے مشاعروں کی بھی کرسیاں فل ہو جاتی ہیں۔ شعراء میں اچھے ذوق والے، سنجیدہ، پختہ ذہن والے لوگ زیادہ ہوتے ہیں۔ جو دنیا کے باقی تمام کاموں سے فارغ ہو چکے ہوتے ہیں کیونکہ جب کوئی شاعری شروع کر دیتا ہے تو وہ پھر کسی اور کام کے قابل نہیں رہتا۔ کئی مشاعروں میں شعراء کو ”لفافہ“ بھی پیش کیا جاتا ہے یہ شاعر کی جسامت کے مطابق ہوتا ہے۔ شاعر ”مکرر“ کے لفظ پر بہت خوش ہوتا ہے۔ اگر کوئی مکرر نہ کہے تو شاعر اپنے شعر کو ذرا گہرا سمجھتا ہے۔ کئی شعراء شعر اس طرح پڑھتے ہیں جیسے نثر پڑھ رہے ہوں۔ کئی ایسے بزرگ شعراء ہیں کہ وہ اپنا کلام مسکرا کر ترنم سے پڑھتے ہیں کہ انکا کلام ترنم اور مسکراہٹ ہی میں دب کر رہ جاتا ہے۔ ایسے شاعر پہلے اپنے مجموعے گنواتے ہیں شعر بعد میں پڑھتے ہیں اور چلتے چلتے یہ بھی بتاتے ہیں کہ سب سے پہلے شاعری انہوں نے ہی شروع کی تھی۔ ہر شاعر کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی باری دوسروں کے بعد آئے آخر میں پڑھنے والا شاعر بڑا اور سینئر شاعر ہوتا ہے۔ مشاعرے کے صدر کی باری آخر میں آتی ہے۔ اکثر شعراء ترنم سے پڑھتے ہیں مگر بہت کم کو سامعین توجہ سے سنتے ہیں اگر کسی بے سُرے ترنم پر لوگ ہنسنا شروع کر دیں تو تو شاعر مزید لہک لہک کر پڑھنے لگ جاتا ہے۔ شاعر گھر میں کم اور باہر زیادہ بولتا ہے۔ شاعر اپنا لکھا ہوا کلام جب تک کسی کو سنا نہ لے اس کی حالت ایسے ہوتی ہے جیسے کسی ہیروئین پینے والے کا نشہ ٹوٹا ہوا ہو۔ شاعر کو اکثر شاعر ہی سنتا ہے کیونکہ سننے کے بعد اسے بھی کچھ سنانا ہوتا ہے۔ مگر یہ بات مسلم ہے کہ برطانیہ میں اردو زبان کی بقاء ان شعراء کے دم سے ہے۔ جب تک یہ شعراء زندہ رہیں گے لوگ سنتے سناتے رہیں گے اردو زندہ رہے گی تو انہی شاعروں اور ان کے مشاعروں کی انعقاد کی وجہ سے۔ ورنہ یہی شعراء جب اپنے گھر جاتے ہیں تو انہیں اپنے بچوں اور اُن کے بچوں کے ساتھ انگلش میں ہی بات کرنی پڑتی ہے.....زبان تو ان کی اُردو بھی کوئی نہیں سنتا نہ سمجھتا ہے۔

نُزہت انجم گورکھپور

قرض غم کا چکانا پڑا ہے
رو کے بھی مسکرانا پڑا ہے
سچ کو سچ کہہ دیا تھا اسی پر
میرے پیچھے زمانہ پڑا ہے
اِک خدا کے آگے جھکے تو
در بدر سر جھکانا پڑا ہے
تجھ کو اپنا بنانے کی خاطر
سب کو اپنا بنانا پڑا ہے
کیا بتائیں کہ کن مشکلوں میں
زندگی کو نبھانا پڑا ہے
سنگدل جو ہیں مشہور نُزہت
شعر اُن کو سنانا پڑا ہے

قریشی داؤد احمد ساجد

اک ذرا سی بات پہ رستہ بدل جاتے ہیں لوگ
جانے کیسے ٹھوکریں کھا کر سنبھل جاتے ہیں لوگ
زر کے ہاتھوں بِک رہا ہے آج انساں بھی یہاں
گو عدو کے گھر میں ہو دولت بہل جاتے ہیں لوگ
خاک میں عزت ملا لیتے ہیں دولت کے لئے
یوں زمانے کے نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ
سوچتا ہوں دیکھ کے بے لوث الفت کا صلہ
چکنے برتن کی طرح کیسے پھسل جاتے ہیں لوگ
اک زماں ہوتا ہے کندھے پہ اُٹھا لیتے ہیں سب
پھر لحد میں رکھ کے خود باہر نکل آتے ہیں لوگ
کیوں کریں کس پر کریں ساجدؔ بھروسہ دہر کا

شفقتوں کے ہاتھ نیچے بھی مسل دیتے ہیں لوگ

عابد حسن منٹو کے خیال میں بخش لائلپوری کی شاعری

بخش لائلپوری کا تیسرا مجموعہ کلام ''بادِ شمال'' بھی اس روایت کا مظہر ہے جو ان کے دوسرے مجموعہ کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ روایت تیسری دنیا کے مظلوم عوام کی آزادی، بہتر زندگی، اور حسین مستقبل کی تمنا اور ان مقاصد کے حصول کے لئے جدوجہد سے عبارت ہیں۔ بخش لائلپوری تیسری دنیا کے مسائل کے بارہ میں مجرد خیالات کا اظہار نہیں کرتا آمریت بنیاد پرستی، طبقاتی استحصال، ا ور انسانی قدروں کی پامالی کی ساری تصویر پاکستان کے حوالے سے ان کے اشعار میں موجود ہے اپنے وطن سے گہری محبت کا جذبہ ان کی مزاحمتی شاعری کو مثبت طرزِ حیات سے مزیّن کرتا ہے بے باکی اور راست بیانی بخش لائلپوری کی خصوصیت ہے بخش لائلپوری کی شاعری ہم عصر شاعری کے تجریدی اور مبہم طرزِ اظہار سے پاک ہے کلاسیکی اسلوب نے بھی انہیں مغلوب نہیں کیا ان کی شاعری کا اپنا لب ولہجہ ہے اپنا آہنگ ہے ۔جدّت فکر سے عبارت ان کی غزل نظریئے اور فن کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔

طفیل عامر

کیوں بجھا سا لگتا ہے
دل دُکھا سا لگتا ہے
پھر نظر نہ آئے گا!
ہم نوا سا سا لگتا ہے!
یوں تو وہ نہیں کوئی
آسرا سا لگتا ہے
وہ خلوص مندی میں
اک دعا سا لگتا ہے
اپنی کامرانی سے
سَر اُٹھا سا لگتا ہے
عامر آخری مصاف
کربلا سا لگتا ہے

بخش لائلپوری

پندار و رعونت کا پیکر
ہر پیرِ مغاں کی ہستی ہے
مسجد میں درسِ فقیری
حجرے میں عیش پرستی ہے
ہر دین مبین کی مسند پر
بے دینوں کی خرمستی ہے
یہ مُلّا جی کی بستی ہے
اس بستی کو برباد کرو
صدیوں کے پرانے معبد پر
اک دنیا نئی آباد کرو
ہر چور یہاں کا رہبر ہے
ہر پیر ہوس کا بندہ ہے
ہر دل میں ہے زہر تعصب کا
ہر سر میں جنوں کا پھندا ہے
ہر علم و ادب کے مکتب میں
کج ذہن کی بالا دستی ہے
یہ مُلّا جی کی بستی ہے
اس بستی کو برباد کرو
اس فکر و نظر کے گلشن کو
گُل چینوں سے آزاد کرو
یہ فسق و فسوں کی محفل ہے
ہر جسم یہاں کا گندہ ہے
تم مردِ خدا جسے کہتے ہو
وہ اپنے نفس کا بندہ ہے
یہ کذب بیانی کا مرقد
یہ ایمانوں کی پستی ہے
یہ مُلّا جی کی بستی ہے
اس بستی کو برباد کرو
تبلیغِ جنوں کے پنجوں سے
انسانوں کو آزاد کرو
چہروں پہ نمائش کی داڑھی
بغلوں میں ریا کا خنجر ہے
اخلاق کی مردہ لاشوں پر
یہ حرص و ہوا کا مندر ہے
ہر سانس گراں ہے جینے کی
اور موت یہاں پر سستی ہے
یہ مُلّا جی کی بستی ہے
اس بستی کو برباد کرو

نظروں کے دریچے چھلنی ہیں
اوہام کے رنگیں خاروں سے
وحشت کی صدائیں آتی ہیں
اس بستی کے بازاروں سے
یہ شرک و شرر کی دنیا ہے
انساں کی تیرہ بختی ہے
یہ مُلّا جی کی بستی ہے
اس بستی کو برباد کر
صدیوں کے پرانے معبد پر
اک دنیا نئی آباد کر

اسحاق ساجد۔۔ مدیر سہ ماہی ''سمندر انٹرنیشنل'' جرمنی۔قریشی داؤد احمد ساجد کی کتاب ''سرِ راہ چلتے چلتے'' کے متعلق رقم طراز ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان صرف لیل ونہار،لب ورخسار،زلفِ یار اور فرضی محبوب کی وفاؤں اور جفاؤں کا نام نہیں۔ بلکہ اس کے وسیلے سے ہم تاریخ ،سماجیات،اقتصادیات،روحانیات اور قومی وملی تعمیر وترقی کے اہم گوشوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔داؤد ساجد صاحب اس حقیقت سے واقف نظر آتے ہیں اور کہیں کہیں وہ ان کا ذکر اپنے اشعار میں بھی کرتے نظر آتے ہیں۔داؤد ساجد صاحب کی غزلوں میں ایک دھیمی آنچ کی سی کیفیت ہے یہ شعلہ کہیں بھڑک بھی اُٹھتا ہے۔''سرِ راہ چلتے چلتے'' میں داؤد ساجد صاحب نے اپنی شاعری کے ابتدائی ایام سے سماجی مسائل کو سمجھنا شروع کر دیا تھا۔جیسے کہ ان کے اشعار سے ظاہر ہے۔ساجد صاحب کی اکثر غزلیں فکر واحساس سے عبارت نظر آتی ہیں آپ کی شاعری اور شخصیت میں بڑی آہنگی موجود ہے۔آپ کے اشعار میں سماجی،سیاسی،مذہبی اور انسانی جور و جبر ظلم و زیادتی اور ناچاری و بے انصافی کی جانب طنز موجود ہونے کے ساتھ ساتھ تازگی بھی ہے،وارفتگی بھی،اور جوشِ سخن بھی...!! سخنوری کا سفر اگر اسی طرح جاری رہا تو مجھے یقین ہے کہ آپ کی شاعری مزید نکھر کر منزلِ مقصود کو پا کر رہے گی۔انشاء اللہ۔اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

ہم کون ہیں؟.....حافظ محمد سرور قریشی لندن

دیکھئے عندَ مَلیکَ مُقتدَر ہم کون ہیں؟
جب ہیں دشمن کے مقابل منکسر ہم کون ہیں؟
در جہاد حق قدم میں مُنتظر ہم کون ہیں؟
ہیں عدو کے رعب و قوت سے مفر ہم کون ہیں؟
کافرو مسلم کی صورت میں نہیں کوئی امتیاز
پھر تو سب معیارِ حق پر ہوں مُقر ہم کون ہیں؟
حق نے ان کے حق میں کہا تھا صاغرون
آج ان سے ہو گئے ہم اُزدُجرہم کون ہیں؟
کل تھے مسجودِ ملائک پھر ہوئے خیرالامم
در پہ دشمن کے گئے ہیں اب جو گھر ہم کون ہیں؟
کل تلک تھے محسنین و موجب امن و سکون
آج عالم کے لئے ہیں سب مُضرہم کون ہیں؟
اپنا انجامِ عمل دیکھا نہیں تو دیکھ پھر
حق سے کہیئے یا الٰہی! انتظر ہم کون ہیں؟
گر چہ ہم مبتلائے ظلمت ظلم و ستم
خود فریبی سے نہیں مانا کہ پھر ہم کون ہیں؟
مومنین ہر گز نہیں کر سکتے اصرارِ گناہ
ہم تو ہر ظلم و ستم پر ہیں مُصر ہم کون ہیں؟
جاہلی اعمال سے ہم ہو گئے ہیں ناتواں
کر دیا یوں حق کو بھی بے مستمر ہم کون ہیں؟
دین حق کی نورِ افشاں سب مٹ گئیں
وہ بھی ہم سا ہو گیا ہے مُنکسر ہم کون ہیں؟
منکرین حق،جہان حق میں ہوں اعلون کل
مومنین ہو جائیں کذاب الاشر ہم کون ہیں؟
کھل رہے ہیں بر عدو حکمت کے اسرازو رموز
ہم پہ اب کھلتا نہیں کوئی بھی سِرّ ہم کون ہیں؟
یہ تصوف کا ہے موہومی کراماتی ثمر
ہو گئے دشمن سے ہم روباہِ حذر ہم کون ہیں؟
کل جہاں میں متحد مرصوص تھے توحید سے
آج کیوں ہیں گھشیم المختظر ہم کون ہیں؟
ہر کوئی عالم میں ہم سے ہو گیا بیزار ہے
کوئی بھی ہم پر نہیں ہے مُفتخر ہم کون ہیں؟
نعمتِ توحید سے حق نے کیا تھا متحد
کر دیا ابلیس نے پھر منتشر ہم کون ہیں؟
جس طرح رسوا تھے ہم حق کو بھی ویسا کر دی
ہو گئی تبلیغِ دین اب عَسر ہم کون ہیں؟
حق سے مومن کو ملی تھی شانِ عالی ذکر میں
پھر یہ ذلت چھا گئی کیوں مُنھمر ہم کون ہیں؟

نیک و بد اور حق و باطل میں ہے الفت ایک سی
کچھ نہیں اب فرق بین الشر و بر ہم کون ہیں؟
سابقہ اقوام حقہ میں سدا تجدید تھی
ہو گئے اس حق دینی سے کُفر ہم کون ہیں؟
ہمنے پوچھا ہی نہیں ہر گز کبھی قرآن سے
ہو گئے احکامِ حق سے جب مُفر ہم کون ہیں؟
کھو گیا معیارِ حق نفس و ہوای کے عشق میں
رہ گیا ”فقہ“ میں جو کچھ ہے ذکر ہم کون ہیں؟
صدر اول میں ہوا اعلائے حق اخلاق سے
رہ گئے اب بندگانِ زَر کُدر ہم کون ہیں؟
کیوں سبق آموز ہوتے ہی نہیں ہرگز کبھی
کوئی بھی باقی نہیں اک مُدّکر ہم کون ہیں؟
اکثریت ہو گئی ہے تابع نفس و ہوائے
پھر بھی کی جاتی تجدید پھر ہم کون ہیں؟
کیوں نہیں دل میں رہا کچھ نورِ عبرت حافظاؔ!
جل رہے ہیں رات دن جب درسُعر ہم کون ہیں؟

حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ ۔محمد ابراہیم عابدؔ

آپ کا نام مبارک احمد شیخ تھا۔مقام کے سبب سرہندی مشہور ہوئے۔آپ کے والد بزرگوار کا نام حضرت مخدوم شیخ عبدالاحد صاحب تھا۔بیان کیا گیا کہ آپ کا نسب نامہ حضرت عمر بن خطابؓ سے جا کر ملتا ہے۔ ہندوستان کے معروف بزرگ حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر بھی انہی کے جدامجد کے سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔آپ کے خاندان کے بزرگ کابل سے تشریف لائے تھے۔اور سرہند میں اقامت اختیار کی ۔جس کا قدیمی نام سرہند تھا۔آپ کی پیدائش جمعۃ المبارک ۱۴شوال ۹۷۱ ہجری بمطابق ۱۵۶۳ء کی ہے۔حصول تعلیم کے لئے آپ سیالکوٹ تشریف لے گئے۔اس وقت یہ شہر علم کا مرکز تھا۔ یہاں سے شیخ یعقوب صاحب صوفی کشمیری اور مولانا کمال صاحب کشمیری سے استفادہ کیا۔۱۷ سال کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہوئے۔اور اسی طرح تعلیم کے لئے لاہور اور دہلی کا سفر بھی کیا۔آپ نے عربی اور فارسی میں کئی رسائل تحریر کئے۔آپ کا ایک مشہور رسالہ ”تہلیلیہ“ ہے۔یہ رسالہ آپ نے شیعہ مسلک کے رد میں تحریر فرمایا۔(شیخ سرہندی مجدد الف ثانیؒ ص۶) سرہند قلعہ کی بنیاد اور آبادی کا آغاز ۶۰ ہجری بتایا جاتا ہے۔سرہند کا قلعہ بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ایک زمانہ میں یہ ہندوؤں اور غزنویوں کے درمیان سرحد کا کام دیتا تھا۔۔کہتے ہیں اس کے سامنے سے ہند شروع ہوتا تھا۔اس لئے اسے سرہند کہتے تھے۔سلطان محمد غوری نے سرہند کو فتح کیا۔.....کہتے ہیں بابر کئی بار سرہند آیا اور ہمایوں بھی یہیں سے دہلی آ کر دوبارہ تخت وتاج کا مالک بنا۔عہد مغلیہ میں اس شہر کی آبادی اور رونق کا یہ عالم تھا۔کہ یہاں ۳۵۰ مساجد اور سرائیں تھیں۔الغرض حضرت سید احمد سرہندیؒ کی پیدائش سے دوسال قبل سے یہ شہر آباد چلا آتا تھا۔(شیخ سرہندی مجدد الف ثانیؒ ص۳۔۴) بادشاہ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔جب آپ پیدا ہوئے تو ہندوستان پر جلال الدین اکبر کی حکومت تھی۔اس نے دین الٰہی جاری کر دیا تھا۔اس میں ہر مذہب کو خوش رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔۱۰۵۰ ہجری میں جلال الدین اکبر کا انتقال ہو گیا۔اور اس کی جگہ نورالدین جہانگیر تخت نشین ہوا۔جہانگیر نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کو اپنے مستقر پر طلب کر لیا۔اور سرہند کے حاکم کو تاکید کر دی کہ جس طرح بھی ہو سکے آپ کو یہاں بھیج دے۔جب حکم ملا تو آپ پانچ مریدوں کو لے کر روانہ ہوئے۔بادشاہ کو علم ہوا تو اس نے امراء کو آپ کے استقبال کے لئے روانہ کیا۔ایک خیمہ لگوایا گیا۔ملاقات کے لئے طلب کیا۔جب آپ دربار تشریف لے گئے تو جو آداب دربار خلاف شرع تھے وہ آپ بجانہ لائے۔اکبر کے دور میں سجدہ کرنا آداب دربار میں شامل کر دیا گیا تھا۔آپ نے سجدہ نہ کیا۔اس پر درباریوں نے کہا کہ آپ دربار سلطنت بجا نہیں لائے۔بادشاہ نے بھی وجہ پوچھی۔آپ نے فرمایا کہ میں سوائے خدا کے کسی کو سجدہ نہیں کرتا۔اور نہ ہی سجدہ کروں گا۔اس پر بادشاہ سخت ناراض ہوا۔اور اس نے آپ کو گوالیار کے قلعے میں بند کر دیا۔قید سے قبل بادشاہ نے افضل خاں اور خواجہ عبدالرحمان مفتی کو بہت سی فقہ کی کتب سے کر آپ کے پاس بھیجا۔انہوں نے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ سجدہ تحیہ سلاطین کے لئے آیا ہے آپ سجدہ کر لیں آپ کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔اس کے ہم ذمہ دار ہیں۔لیکن آپ نے ان کی بات کو قطعاً پسند نہ کیا۔انکار سجدہ پر آپ کو قید کر دیا گیا۔اسیری کی حالت میں آپ کی حویلی ضبط اور جائیداد ضبط کر لی گئی۔تمام ساتھی جدا کر دیئے گئے۔قید میں آپ نے ریاضت کی۔اور قیدیوں کو پیغام حق پہنچایا۔اور ان کی تربیت کی۔ان کی تبلیغ سے ہزاروں قیدی مسلمان ہوا۔اس طرح آپ نے سنت ابراہیمی پر عمل کیا۔آپ جس تاریخ کو قید کیا گیا تھا تقریباً ایک سال بعد ہی نامعلوم وجوہات کی بنا پر جہانگیر نے آپ کو رہا کر دیا۔اور پھر آپ سے ملاقات کا متمنی ہوا۔اس طرح آپ کی رہائی جمادی ۱۰۲۹ ہجری بیان کی جاتی ہے۔(شیخ سرہندی مجدد الف ثانیؒ ص۱۳ تا ۱۶) مولوی نواب صدیق حسن خان صاحب نے جو اپنی کتاب میں گزشتہ ۱۳ صدیوں کے مجددین کی فہرست دی ہیاس میں لکھتے ہیں۔کہ شیخ سرہندی مجدد الف ثانی ۱۱ویں صدی کے مجدد تھے۔آپ کی عظیم الشان پیشگوئی۔آپ فرماتے ہیں۔آنحضرت ﷺ کے رحلت فرمانے سے ہزار اور چند سال بعد ایک ایسا زمانہ آرہا ہے۔کہ حقیقت محمدیؐ اپنے مقام سے عروج فرمائے گی اور حقیقت کعبہ کے مقام سے متحد ہو جائے گی۔اور اس وقت حقیقت محمدیؐ کا نام حقیقت احمدیؐ ہو جائے گا۔اور ذات احمد جل سلطانہ، کا مظہر بن جائے گی۔اور دونوں اسم

مبارک اپنے مسمیٰ کے ساتھ متحقق ہو جائیں گے۔(مکتوبات امام ربانی مکتوب نمبر ۲۰۹ دفتر اول حصہ سوئم ص ۱۴۱) **وفات**۔یہ مرد جلیل ۲۸ صفر ۱۰۳۴ ہجری دنیائے فانی سے دار آخرت کو چل دیا۔آپ نے ۶۳ برس کی عمر پائی۔اللہ تعالی آپ پر ابدی رحمتیں نازل فرمائے۔آمین۔آپ کے سات بیٹے تھے۔تین کم سنی میں فوت ہوئے۔چار کے نام یہ ہیں ۔خواجہ محمد صادق صاحب ۔۲۔خواجہ محمد معصوم صاحب۔۳۔خواجہ محمد سعید صاحب۔۴۔خواجہ محمد یحییٰ صاحب ۔

سہا شیوی

امن کا نشان ہے اردو
سب کی ہی ترجمان ہے اردو
ناز کیونکر نہ ہو ہمیں اس پر
شاعروں کی زباں ہے اردو
آج محسود روزگار ہے تو
تیری کیا آن بان ہے اردو
جو زبانیں یہاں مروج ہیں
سب میں میٹھی زبان ہے اردو
طرز و تحریر کی روانی سے
کچھ عجب تیری شان ہے اردو
چھا گئی ہے تمام عالم پر
اور ابھی جوان ہے اردو
ہر حقیقت شناس کہتا ہے
ملک و ملت کی شان ہے اردو
اس سے محفوظ ہے یہاں کا ادب
اے سہا پاسبان ہے اُردو

پروفیسر گوپی چند نارنگ اقبال حیدر کی کتاب ''بے آب زمینیں'' پر تبصرہ فرماتے ہیں:۔

سید اقبال حیدر کو میں ایک مدت سے جانتا ہوں اور ادھر کچھ برسوں سے ان کی ادبی سرگرمیوں سے بھی شناسائی ہے جو وہ حلقہء ادب جرمنی کے ذریعے سرانجام دے رہے ہیں۔وہ ایک پُر امنگ، باہمت اور حوصلہ مند نوجوان ہیں یورپ خصوصاً جرمنی جیسے ملک میں اردو ادب کے لئے ان کی خدمات قابل تعریف ہیں اور اردو اگر کرہء ارض میں پھیل رہی ہے اور دنیا کے نقشہ پر یہاں وہاں کچھ روشن نشان نظر آتے ہیں تو وہ ان جیسے جیالوں کی وجہ سے ہیں شاعری سے ان کی یاد پرانی ہے اردو روایت میں رچے بسے ہیں نئے حقائق سے نبرد آزما ہو کر تازہ گوئی کا حق ادا کرنے پر قادر ہیں خدا انہیں شاد آباد رکھے اور وہ ترقی کرتے رہیں برصغیر کے جو حالت ہیں سو ہیں اگر اردو نئی بستیوں میں پھلتی پھولتی نظر آئے تو خوشی ہونی چاہیئے۔پروفیسر گوپی چند نارنگ دہلی انڈیا

آسان نسخہ

جہاں تک کام چلتا ہو غذا سے
وہاں تک چاہیئے بچنا دوا سے
اگر تجھے لگے جاڑوں میں سردی
تو استعمال کر انڈوں کی زردی
جو ہو محسوس معدے میں گرانی
تو چکھ لے سونف یا ادرک کا پانی
اگر خوں کم بنے اور بلغم زیادہ
تو کھا گاجر چنے شلغم زیادہ
جگر کے بل پر ہے انسان جیتا
اگر ضعفِ جگر ہو کھا پپیتا
جگر میں ہو اگر گرمی دہی کھا
اگر آنتوں میں خشکی ہو تو گھی کھا
تھکن سے ہوں اگر عضلات ڈھیلے
تو فوراً دودھ گرما گرم پی لے
جو طاقت میں کمی ہوتی ہو محسوس
تو پھر ملتانی مصری کی ڈلی چوس
زیادہ گر دماغی ہے تیرا کام
تو کھایا کر شہد کے ساتھ بادام
اگر ہو دل کی کمزوری کا احساس
مربہ آملہ کھا اور انناس
جو دُکھتا ہو گلا نزلے کے مارے
تو کر نمکین پانی کے غرارے
اگر ہو درد سے دانتوں کے بے کل
تو انگلی سے دانتوں پہ نمک مل
جو بد ہضمی میں تو چاہے افاقہ
تو کر لے ایک دو وقت فاقہ

زندگی کیا ہے.....؟ راجہ منیر احمد

ایک ایسا سوال جس پر شاید آپ نے بھی غور نہ کیا ہو، تو اب کر لیجیے۔

زندگی میں ایسے بھی لمحات بھی آتے ہیں جب انسان خود کو اتنا بے بس محسوس کرتے

ہیں، کسی کی نصیحت تو کیا، اپنا آپ بھی برا لگتا ہے۔ ایسے لوگ زیادہ تر اپنی راہیں کھوٹی کر دیتے ہیں، اور انہیں احساس اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ خود کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ٹھیک لگنے اور ٹھیک ہونے میں بہت بڑا فرق ہے ۔ ہم بسا اوقات بہت کچھ ایسا کر جاتے ہیں جو ہمیں ٹھیک لگتا ہے۔ جبکہ ہوتا اس کے برعکس ہے۔ یہی تو زندگی ہے جو ہر سانس لینے والے کے پاس موجود تو ہے۔ لیکن ہر کوئی اسکا استعمال نہیں جانتا۔ اگر اس کی بہت بھاری قیمت دے کر اپنی ضد اور خواہش سے حاصل کیا ہوتا۔ تو اس کی حفاظت بھی کرتے اور دنیاوی غلاظت سے اسے بچا کر اور پاک صاف بھی رکھتے ۔ لیکن صد افسوس! ہمیں دنیا میں سب سے پہلا تحفہ جو ملتا ہے وہ زندگی ہی تو ہوتی ہے ۔ کسی بھی چیز کی قدر و قیمت کا اندازہ ہمیں تبھی ہوتا ہے جب وہ چیز ہم سے چھن جاتی ہے۔ صوفی یا عالم کی زبان میں زندگی ''اللہ اللہ'' کرنے کا نام ہے۔ استاد کے نزدیک زندگی علم حاصل کرنے اور اسے آگے پھیلانے کا نام ہے۔ ڈاکٹر کے مطابق زندگی بیماری اور شفاء کے درمیان لٹکا ہوا پنڈولم ہے۔ کسی معروف شخصیت کے نزدیک زندگی کام، کام اور صرف کام ہے۔ اور کچھ کے نزدیک زندگی جہد مسلسل کا دوسرا نام ہے۔ ایک ناکام انسان کے نزدیک زندگی ناکامیوں کا مجموعہ ہے۔ بعض سست اور کاہل لوگوں کا کہنا ہے کہ زندگی خود کو مصروف رکھنے اور بعد میں میٹھی نیند سونے کا نام ہے۔ خیر یہ تو تھے مختلف لوگوں کے مختلف خیالات زندگی کے متعلق۔ سوال یہ ہے کہ آپ کی نظر میں زندگی کا کوئی مفہوم ہے ۔؟اگر ہے تو کیا ہے؟ سوچئے، ضرور سوچئے اور بھر پور سوچیے

غالب ماجدی لندن.....معذرت

میں چاہتا ہوں معذرت میرا نہ چھاپیئے
گوشے میں رہنے دیجیئے گوشہ نہ چھاپیئے
ہمدرد میرے آپ ہیں مخلص ہیں دوست ہیں
صد شکر ہے کہ آپ نے پوچھا نہ چھاپیے
مجھ کو نہیں پسند کہوں دوستوں سے میں
لکھو میرا قصیدہ ، قصیدہ نہ چھاپیے
خود سے کوئی لکھے مجھے اچھا برا بھلے
وہ چھاپیے پہ اس کے علاوہ نہ چھاپیئے
جس کو کہیں کہ شعر ہے اب تک نہیں کہا
تکبندیوں کا میری پلندہ نہ چھاپیئے
شاعر نہیں حقیر سا خادم ادب کا ہوں
اہل سخن میں نام تو میرا نہ چھاپیئے
رسوا کرے گی شاعری مجھ کو خبر نہ تھی
اُفتاد طبع غالب رسوا نہ چھاپیئے

نوشیرواں عادل کے اقوال زریّں ۔۔رانا عبدالو حیدخاں

۱۔ جب تک کہ رات دن آتے جاتے ہیں حالات کی تبدیلیوں پر تعجب مت کر۔ کیونکہ ہر دن رات میں ایک نئی بات واقع ہوسکتی ہے۔ ۲۔ کیوں لوگ اس کام سے شرمندگی اُٹھاتے ہیں کہ جس کام کے کرنے کی وجہ سے دوسرے شرمندگی اُٹھا چکے ہیں۔ ۳۔ کیوں وہ شخص اپنے آپ کو زندہ شمار کرتا ہے جبکہ اس کی زندگی کا مقصد سوائے عیش و عشرت اور دنیاوی لذت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ۴۔ کیوں تو اس شخص کو دشمن نہیں کہتا جو کہ اپنی طاقت و توانائی کو لوگوں کو نقصان پہنچانے میں استعمال کرتا ہے یعنی خلقِ خدا کے دشمن کو تو کیوں تو اپنا دشمن نہیں سمجھتا۔ ۵۔ کیوں تو اس شخص کو اپنا دوست کہتا ہے جو کہ تیرے دوستوں کا دشمن ہے۔ ۶۔ کسی بے ہنر شخص سے دوستی مت کر کیونکہ بے ہنر شخص دوستی تو کیا دشمنی کرنے کے بھی لائق نہیں۔ ۷۔ اس نادان سے پرہیز کر جو کہ خود کو دانا شمار کرتا ہے۔ ۸۔ اپنی ذات سے دوسروں کو فیض عطا کرتا کہ خدا تعالیٰ تجھے غنی کر دے۔ ۹۔ تو حق کہہ اگرچہ کہ تلخ ہو۔ ۱۰۔ اگر تو چاہتا ہے کہ تیرا راز دشمن نہ جانے تو اپنے دوست سے بھی مت کہہ۔ ۱۱۔ بڑے بزرگوں کو حقیر جان کر نقصان مت اُٹھا۔ ۱۲۔ جس انسان کے پاس کوئی ہنر نہ ہو اس کو زندہ مت شمار کر۔ ۱۳۔ اگر تو چاہتا ہے کہ کسی خزانے کے بغیر بھی تو دولتمند ہو جائے تو قناعت کر۔ ۱۴۔ لاف و گزاف مت خرید، تاکہ اسے بیچنا نہ پڑے یعنی اگر کوئی بڑائیاں مار رہا ہو تو اسے قبول مت کر کیونکہ اگر تو قبول کرے گا تو دوسروں کے سامنے کہے گا اور یہ تیرے حق میں باعث شرمندگی ہوگا۔ ۱۵۔ موت اس سے بہتر ہے کہ ہم رتبہ لوگوں کا احسان اُٹھانا پڑے۔ ۱۶۔ بھوک سے مرجانا بہتر ہے اس سے بہتر ہے کہ کمتر لوگوں کی روٹی سے سیر ہو جائیں۔ ۱۶۔ ہر وہ خیال جو کہ تیرے ذہن میں آتا ہے اس پر اور نا قابل اعتماد لوگوں پر اعتماد مت کر اور قابل اعتماد لوگوں سے اپنے اعتماد کو مت کھینچ لے بلکہ ان پر اپنا اعتماد بحال رکھ۔ ۱۸۔ اپنے لوگوں پر اپنی ذات کی بہ نسبت کم محتاج نہ ہونا ایک بڑی مصیبت ہے۔ جان لے یعنی اپنی ذات پر زیادہ انحصار کرنا بہ نسبت اپنے ساتھیوں کے بہتر ہے، کیونکہ پانی میں مرجانا بہتر ہے اس بات سے کہ کسی مینڈک کی پناہ حاصل کریں۔ ۱۹۔ ایک گنہگار اور اس دنیا کی جستجو میں رہنے والا دنیا دار شخص لیکن جس کے مزاج میں انکساری و عاجزی ہو اس شخص سے بہت بہتر ہے جو کہ عابد و زاہد ہو۔ اور اپنی زندگی آخرت کی دنیا کی جستجو میں گزار رہا ہو۔ لیکن تکبر رکھتا ہو۔ ۲۰۔ اس شخص سے زیادہ نادان کوئی نہیں جو کسی کم رُتبہ شخص کو کسی اعلیٰ مقام تک پہنچتا ہوا دیکھے لیکن پھر بھی اسی انداز میں حقیر جانے۔ ۲۱۔ اس سے بڑھ کر شرم کی اور کوئی بات نہیں ہے کہ آپ کسی چیز کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اسے نہیں جانتے اور اس طرح جھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔ ۲۲۔ اس شخص سے زیادہ حواس باختہ کوئی نہیں جو حاصل شدہ چیز کو کسی ناحاصل چیز کے لئے گنوا

دے۔۲۳۔دنیا میں اس شخص سے کمتر اور کوئی نہیں کہ کسی کو اس سے ضرورت ہو اور وہ اس کی ضرورت پوری کر سکتا ہو۔لیکن وہ اس کے کام نہیں آتا۔۲۴۔ہر وہ شخص جو کہ تجھے بلاوجہ برا کہتا ہے تو اس کو زیادہ معاف کر بہ نسبت اس شخص کے جو تجھ تک وہ بات پہنچاتا ہے۔۲۵۔وہ شخص جس کو کہ کسی بڑی مصیبت کا سامنا ہو اس کی تکلیف اس سے بڑھ کر نہیں جس شخص کے کان بیکار ہوں۔۲۶۔وہ شخص جس نے کہ بڑا نقصان اُٹھایا ہو اس سے بڑھ کر وہ زیادہ نقصان میں ہے جس کو آنکھوں کی بینائی میں نقصاں اُٹھانا پڑے۔ہر وہ غلام جس کو خرید و فروخت کرتے ہیں وہ اس غلام سے زیادہ آزاد ہے جس کو کہ ایک ہی مالک کے تحت باندھ دیا گیا ہو۔۲۸۔ ہر چند کہ کوئی شخص کتنا بھی علم حاصل کرے اور عالم ہو جائے لیکن اگر اس علم کے ساتھ اس کے پاس عقل نہ ہو تو وہ علم اس پر وبال بن جاتا ہے۔۲۹۔ہر وہ شخص جس کو کہ زندگی نے دانائی عطا نہیں کی کسی بھی عقلمند کو چاہیئے کہ ایسے شخص کو سکھانے کی تکلیف نہ اُٹھائے کیونکہ اس کی محنت رائیگاں جائے گی۔۳۰۔نادان شخص کے لئے ہر چیز کی نگہداری کرنا آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ اپنے خود کے معاملات کی نگہداری کر سکے یا اپنا برا بھلا دیکھ سکے۔

خواجہ عبدالمومن ناروے

دیکھے ہیں حسیں میں نے زمانے میں ہزاروں
پر حسن ترا سارے حسینوں سے سوا ہے
کیا نور ہے جو تجھ کو ملا ماہِ مبیں سے
کیا رنگ ہے جو سارے زمانے سے جدا ہے
لب کھلتے ہی پھولوں کی مہک آتی ہے تجھ سے
ہر دل پہ ترے نطق کا جادو سا چلا ہے
سوتا ہوں تو خوابوں میں نظر آتا ہے مجھ کو
حیراں ہوں تو خانہ ویراں میں بسا ہے
کچھ روشنی جو مجھ میں سدا رہتی ہے روشن
یہ تیرا کرم تیری محبت کی ضیاء ہے

زہرہ نگاہ.....مرسلہ بی اے رفیق

سُنا ہے جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے
سُنا ہے شیر کا جب پیٹ بھر جائے
تو وہ حملہ نہیں کرتا،سُنا ہے جب کسی ندی کے پانی میں
پرندے کے گھونسلے کا گندمی سایہ لرزتا ہے
تو ندی کی روپہلی مچھلیاں اُس کو ،پڑوسی مان لیتی ہیں
ہوا کے تیز جھونکے جب درختوں کو ہلاتے ہیں
تو مینا اپنے گھر کو بھول کر،
کوّے کے انڈوں کو پروں میں تھام لیتی ہیں
، سُنا ہے گھونسلے سے جب کوئی بچہ گرے تو ،
سارا جنگل جاگ جاتا ہے
ندی میں باڑ آجائے،کوئی پُل ٹوٹ جائے
تو کسی لکڑی کے تختے پر،
گلہری ،سانپ،چیتا اور بکری
ساتھ ہوتے ہیں
،سُنا ہے جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے
خدا وندا، جلیل و معتبر،دانا و بینا منصف و اکبر
ہمارے شہر میں
اب،جنگلوں کا ہی کوئی دستور نافذ کر

غزل ۔عاصی صحرائی

اپنی عقیدتوں کا نہ ہر گز شمار کر
دل سے مسیح و مہدی کے خلفاء سے پیار کر
دامن ترا خلوص سے خالی نہ ہو کبھی
اس میں گہر ِ وفا کے ابھی تابدار کر
تجھ کو ہے گر یقین کی منزل کی آرزو
دارورسن کی سمت نظر بار بار کر
تسکیں نصیب ہو ہمیں فیض رسول سے
دستِ دعا دراز سوئے کردگار کر
ہونے کو ہے عطاؤں کی برسات جلد ہی
اُٹھی ہے قریہ امام سے گھٹا اعتبار کر
تجھ سے جو لرزاں ہو چکے ہیں تیرے ہی دشمن
فکرو نظر کے دام سے عاصی تُو وار کر

بیسویں صدی کے ٹرین کے بڑے بڑے حادثات

عبدالمجید ظفر

سال	مقام یا ملک	اموات		
1915	اسکاٹ لینڈ	7	2	2
1917	فرانس	3	4	5
1937	بھارت	7	0	1
1939	جرمنی	2	3	1
1944	اسپین	0	0	5

1944	اٹلی	1	2	5
1946	میکسیکو	5	8	1
1949	پولینڈ	0	0	2
1952	پولینڈ	0	6	1
1955	میکسیکو	0	0	3
1957	مشرقی پاکستان	0	5	2
1962	جاپان	3	6	1
1970	ارجنٹینا	6	3	2
1972	میکسیکو	8	0	2
1981	بھارت	0	0	8
1989	روس	5	7	5
1990	پاکستان	0	1	2
1994	انگولا	0	0	3
1997	پاکستان	5	2	1
1997	بھارت		7	7
1998	بھارت	2	1	2
1999	بھارت	0	0	5

مختصر و عجیب

خداترس:۔ایک مرتبہ ایک شخص قائداعظم کے پاس آیا اور اپنے مقدمہ کی تفصیل سنانے کے بعد آپ سے اپنے مقدمہ میں وکیل بن جانے کی درخواست کی۔قائداعظم نے موکل کو سمجھایا '' اپنا روپیہ اور میرا وقت ضائع نہ کرو'' کچھ عرصہ بعد موکل کی ملاقات قائداعظم سے ہوئی ۔ برسبیل تذکرہ موکل نے بتایا کہ ''وہ مقدمہ جیت گیا ہے'' قائداعظم نے حیران ہوکر پوچھا ''وہ کیسے'' موکل نے جواب دیا ''میں نے جج کو قابو کرلیا تھا'' قائداعظم نے فرمایا ''اب ہندوستان میں برطانوی حکومت کے دن گنے جاچکے ہیں۔آزاد، ایماندار اور خداترس عدلیہ ہی کسی نظام کی ضامن ہوتی ہے۔جب عدلیہ میں یہ صفات نہ رہیں تو ہر نظام حکومت ختم ہوجاتا ہے۔ جنت دوزخ کی زبانیں ''ایک بوڑھا روسی پارک میں بیٹھا عربی زبان کی ابتدائی کتاب پڑھ رہا تھا۔'' کے جی بی'' (خفیہ ایجنسی) کے ایک ایجنٹ کی نظر اس پر پڑی تو وہ ٹھٹھک کر رہ گیا اور بوڑھے سے پوچھا۔ایجنٹ۔یہ کون سی زبان پڑھ رہے ہو؟ بوڑھا۔میں نے سنا ہے کہ جنت میں عبرانی زبان بولی جاتی ہے۔ایجنٹ (مسکراتے ہوئے) مگر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ تم جنت میں نہ جاؤ۔بوڑھے نے برجستہ جواب دیا تو کیا فرق پڑے گا مجھے۔روسی زبان بھی آتی ہے مجھے۔

مجبوری

کسی گاؤں میں ایک لوہار رہتا تھا۔جو سنگین جرم کا مرتکب ہوا۔جو ثابت ہوگیا۔مگر مجبوری یہ آڑے آئی کہ سارے گاؤں میں ایک ہی لوہار تھا۔جبکہ درزی تین تھے۔ چنانچہ خانہ پُری کرتے ہوئے لوہار کی بجائے ایک درزی کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

آخری شکار

ایک دفعہ کسی بیمہ کمپنی کا ایجنٹ بیمار ہوگیا جب مریض کی حالت تشویش ناک ہوگئی تو گھر والوں نے پادری صاحب کو آخری رسوم کیلئے بلوا بھیجا۔خاصی دیر کے بعد جب پادری صاحب مریض کے گھر سے نکلے تو معلوم ہوا کہ مریض نے پادری صاحب کی زندگی کا بیمہ کردیا ہے۔

نئی قید

فرائیڈ کا بیٹا مارٹن جنگی قید سے رہائی کے بعد لوٹا تو فرائیڈ نے اپنے ایک دوست کے نام خط میں اس کے بارے میں لکھا۔مارٹن میرا بیٹا اطالیہ کی قید سے رہا ہوکر آیا ہے تو اسے وی آنا کے ایک وکیل کی بیٹی نے اپنا قیدی بنا لیا ہے ۔

کارگر حربہ۔

بات ہورہی تھی دو سہیلیوں میں شوہر سے حیلوں بہانوں سے پیسے اینٹھنے کی۔ایک نے کہا مجھے تو جب بھی پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے تو میں اپنے شوہر کو دھمکی داغ دیتی ہوں کہ میں اپنے میکے جارہی ہوں۔اور وہ کوئی بحث یا تکرار کئے بغیر مجھے کرائے کی رقم تھما دیتے ہیں۔

خوشی

دوسروں کی خوشیاں اپنے دامن میں سمیٹ کر یہ مت بھولیں کہ آج آپ جس عمارت کی بنیاد چوری کی اینٹ سے رکھ رہے ہیں وہ کبھی نہ کبھی ضرور گرے گی۔کسی اور کے نہیں آپ کے اپنے اوپر۔دریا اور زندگی دونوں پر بند باندھنا پڑھتا ہے۔تاکہ وہ ضائع ہونے سے بچ جائیں دریا پر مٹی کا بند اور پیکر خاکی کو ضبط کا بند درکار ہوتا ہے۔امید ایک چھاؤں ہے جو انسان کو اپنے دامن میں پناہ دے کر مایوسی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبنے سے بچاتی ہے۔بعض رشتے اتنے اہم ہوتے ہیں جنہیں بدلتے ہوئے پُل صراط پر سے گزرنے کا گمان ہوتا ہے۔روح کی گہرائی سے نکلی ہوئی بات روح کی گہرائیوں میں مختلف ہوتی ہیں جسے ہم سمجھ نہیں پاتے۔تک ضرور جاتی ہے۔دُعا کبھی رائیگاں نہیں جاتی البتہ قبول ہونے کی

ہنسنا منع ہے۔

ایک نئے گلوکار نے اپنے پڑوسی سے شکایت کرتے ہوئے کہا'' جناب جب بھی میں گانا شروع کرتا ہوں۔آپ کا کتا بھونکنے لگتا ہے''۔پڑوسی نے کہا کہ اس میں کتے کا کیا قصور ہے۔پہل تو آپ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔

باعث تاخیر

ا۔کمپنی کے مالک تاخیر سے دفتر پہنچنے والوں سے باز پرس کررہے تھے۔'' تم دیر سے کیوں آئے ہو؟ پورے بیس منٹ لیٹ؟'' ''سر میں دسویں منزل کی کھڑکی سے گر گیا تھا'' ''جھوٹ مت بولو، دسویں منزل سے گرنے میں بیس منٹ نہیں لگتے''۔۲۔''تم دیر سے کیوں آئے ہو؟'' ''سر میری نانی کا انتقال ہوگیا تھا'' اچھا آئندہ خیال رکھنا، دوبارہ ایسا

ہیں ہونا چاہیئے"۔۳۔" تم دیر سے کیوں آئے ہو؟" سر بس نہیں مل رہی تھی؟ "اسی لئے کہتا ہوں کہ دفتر جانے کے لئے رات ہی کو چیزیں ڈھونڈ لیا کرو"۔۴۔" تم دیر سے کیوں آئے ہو؟ سر میں سیڑھیوں میں سے پھسل گیا تھا۔اس قسم کے کام فرصت کے اوقات میں کیا کرو۔۵۔" تم دیر سے کیوں آئے ہو؟ سر کل میری منگنی تھی۔صبح دیر سے آنکھ کھلی"۔۶۔" تم دیر سے کیوں آئے ہو؟" سر میں بے ہوش ہو گیا تھا" اسی لئے کہتا ہوں ہوش میں رہا کرو"۔ مالک (نوکر سے) "تم کیوں رو رہے ہو۔بلی تو میری مری ہے؟ نوکر۔" جناب میں اب دودھ پینے کا الزام کس پر لگاؤں گا؟" ایک دوست دوسرے سے۔" اگر دنیا میں پانی ختم ہو جائے تو۔۔۔۔؟ دوسرا دوست۔" دودھ تو خالص ملے گا" دو بیوقوف کہیں جا رہے تھے راستے میں ایک جگہ انہیں دو بم نظر آئے۔پہلا بولا چلو یہ ہم پولیس کو دے آتے ہیں۔دوسرا بولا اگر راستے میں ایک بم پھٹ گیا تو۔۔۔۔؟ پہلے نے جواب دیا کوئی بات نہیں پولیس سے کہہ دیں گے کہ ایک ہی ملا تھا

زبان۔۔۔اگرچہ تلوار نہیں مگر تلوار سے زیادہ تیز ہے۔بات۔۔۔۔۔اگرچہ تیر نہیں مگر تیر سے زیادہ گہرا اثر کرتی ہے۔

غصہ۔۔۔۔ شیر نہیں مگر شیر سے زیادہ خطرناک ہے

نشہ۔۔۔ اگرچہ خنجر نہیں مگر خنجر سے زیادہ اذیت ناک ہے۔

گناہ۔۔۔۔ اگرچہ زہر نہیں لیکن زہر سے زیادہ مہلک ہے

ابتدائی حساب۔حساب کی چار بڑے قاعدے ہیں۔

جمع۔تفریق۔ضرب۔تقسیم۔جمع

جمع کے قاعدہ پر عمل کرنا آسان نہیں۔خصوصاً مہنگائی کے دنوں میں۔سب کچھ خرچ ہو جاتا ہے۔کچھ جمع نہیں ہو پاتا۔جمع کا قاعدہ مختلف لوگوں کے لئے مختلف ہے۔عام لوگوں کے لئے ایک جمع ایک مساوی ڈیڑھ۔کیونکہ آدھا انکم ٹیکس والے کھا جاتے ہیں۔تجارت دو کے قاعدے سے جمع کریں تو ایک جمع ایک کا مطلب ہے گیارہ۔ناجائز آمد سے قاعدے کا حاصل جمع اور زیادہ ہو جاتا ہے۔قاعدہ وہی اچھا ہے جس میں حاصل جمع زیادہ سے زیادہ آئے۔بشرطیکہ قانون حائل نہ ہو۔ایک قاعدہ زبانی جمع خرچ کا ہوتا ہے۔جو ملک کے مسائل حل کرنے کے کام آتا ہے۔آزمودہ ہے۔

تفریق

میں سندھی ہوں تو سندھی نہیں۔میں پنجابی ہوں تو پنجابی نہیں۔میں مسلمان ہوں تو مسلمان نہیں۔اس کو تفریق پیدا کرنا کہتے ہیں۔حساب کا یہ قاعدہ بھی قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے۔تفریق کا ایک مطلب ہے، منہا کرنا۔یعنی نکالنا ایک عدد کو دوسرے عدد سے۔بعض عدد از خود نکل جاتے ہیں۔بعضوں کو زبردستی نکالنا پڑتا ہے۔ڈنڈے مار کر نکالنا پڑتا ہے۔فتوے دے کر نکالنا پڑتا ہے۔ایک بات یاد رکھیئے۔جو لوگ زیادہ جمع کر لیتے ہیں۔وہی زیادہ تفریق بھی کرتے ہیں۔انسانوں اور انسانوں میں۔مسلمانوں اور مسلمانوں میں۔عام لوگ تفریق کے قاعدے کو پسند نہیں کرتے۔کیونکہ حاصل تفریق کچھ نہیں آتا۔آدمی ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔

ضرب

اس کی قسمیں ہیں۔ مثلاً ضرب خفیف، ضرب شدید، ضرب کاری وغیرہ۔ضرب کی ایک اور تقسیم بھی ہے۔پتھر کی ضرب۔لاٹھی کی ضرب۔بندوق کی ضرب۔زبان کی ضرب۔ضرب باطنی۔ضرب دل۔ضرب دوست۔حاصل ضرب۔، ضرب مومن۔ضرب کلیم اس کے علاوہ ہے۔حاصل ضرب کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ ضرب کس چیز سے دی گئی ہے۔آدمی کو آدمی سے ضرب دیں تو حاصل ضرب بھی آدمی ہی ہوتا ہے۔لیکن ضروری نہیں کہ وہ زندہ ہو۔ضرب کے قاعدے سے کوئی سوال حل کرنے سے قبل اپنے ملک کا قانون پڑھ لینا چاہیئے۔

تقسیم

یہ حساب کا بڑا ضروری قاعدہ ہے۔سب سے زیادہ جھگڑے اسی پر ہوتے ہیں۔تقسیم کا مطلب ہے بانٹنا۔اندھوں کا آپس میں ریوڑیاں بانٹنا، بندروں کا بلیوں میں روٹی بانٹنا۔چوروں کا آپس میں مال بانٹنا۔اہلکاروں کا آپس میں رشوت بانٹنا۔مل بانٹ کر کھانا اچھا ہوتا ہے۔بعض لوگ دال تک جوتوں میں بانٹ کر کھاتے ہیں ورنہ قبض کرتی ہے۔تقسیم کا طریقہ کچھ مشکل نہیں۔حقوق اپنے پاس رکھیئے۔فرائض دوسروں میں بانٹ دیجیئے۔روپیہ پیسہ اپنے کیسے میں ڈالئے قناعت کی تلقین دوسروں کو کیجیئے۔آپ کو مکمل پہاڑہ مع گر یاد ہو تو کسی کو تقسیم کی کانوں کان خبر نہیں ہو سکتی

ایک اور وصیت.......مس الزبتھ نے مرنے کے وقت منظوم وصیت کی۔جس کا مطلب تھا کہ" جب میری زندگی کی ندی اُتر جائے تو میرے جسم کو نذر آتش کر دیا جائے۔اور اس کی لاش کو دریائے جار کی موجوں کے سپرد کر دیا جائے۔لیکن اگر دریا کا پانی برف میں تبدیل ہو چکا ہو۔تو راکھ کو ایک کشتی میں رکھ کر دور ساحل سے ایک میل سمندر میں لے جایا جائے۔تاکہ خدا کا وسیع سمندر مجھے ہمیشہ کے لئے اپنی آغوش میں لے لے۔۔

وصیت کی رُو سے......امریکہ کے شہر کنکی کے شہر کی ایک بیوہ مسز یل جب مریں تو اُن کی وصیت پڑھی گئی۔تو معلوم ہوا کہ اس نے دو کروڑ ڈالر کی رقم صرف اُن رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کی وصیت کی ہے۔جنہوں نے نہ کبھی شراب پی ہو اور نہ کبھی نائٹ کلب میں گئے ہوں۔مرنے والی کے رشتہ داروں میں صرف ایک ہی فرد ایسا تھا جو ان شرائط پر پورا اُترتا تھا اور اُس کی عمر دو سال تھی۔

کتنی دور سے..ایک عدالت میں ٹریفک کا ایک مقدمہ پیش ہونے پر وکیل نے گواہ پر جرح کرتے ہوئے پوچھا" آپ کہتے ہیں کہ آپ اس وقت جائے وقوعہ سے ۳۵ فٹ دور تھے۔کیا آپ عدالت کو بتائیں گے کہ آپ کتنے فاصلے سے صاف دیکھ سکتے ہیں؟ گواہ نے جواب دیا جب میں صبح اُٹھتا ہوں تو روزانہ سورج کو صاف دیکھ لیتا ہوں اور سنا ہے کہ" سورج ہم سے نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے"۔

درباری.....ایک دانشور نے ایک بادشاہ سے کہا کہ آ

کے تمام درباری جھوٹے، خوشامدی اور کھوٹے ہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ میں آپ کی یہ رائے کیسے مان لُوں جو میرے اشاروں پر جان نچھاور کرنے کو ہر دم تیار رہتے ہیں۔ اس دانشور نے بادشاہ کو کچن میں چلنے کو کہا۔ کچن میں پہنچ کر دانشور فلسفی نے پانی گرم کیا اور کیتلی میں چائے کی بجائے تمباکو ڈال کر اسے دربار میں لے آیا۔ اور بادشاہ سے کہا کہ اب آپ اپنے درباریوں کو بلائیے اور ہر ایک کو ایک ایک پیالی تمباکو کے قہوے کی عطا فرمائیے۔ لیکن اس سے پہلے اپنی پیالی کو اپنے ہونٹوں سے لگا کر قہوہ کے ذائقے کی تعریف کر دیجیئے۔۔ بادشاہ نے ایسا ہی کیا۔ بادشاہ کے قہوہ کی تعریف کرنا تھا کہ درباریوں نے قہوے کی تعریف کے پُل باندھ دیئے۔ ہر طرف سے ''واہ واہ'' کے دونگڑے برسنے لگے ایک نے کہا ''سبحان اللہ'' آبِ حیات ہے۔ دوسرا بولا'' آبِ کوثر ہے۔ تیسرے نے کہا کہ جُوئے شہد ہے۔ یہ دیکھ کر بادشاہ نے حکم دیا کہ ''ان سب کو لے جا کر طویلے میں باندھ دو۔